بی۔اے : سال اول (سیمسٹر ۲)

(اردو لازمی)

F. Y. B. A. (Semister - II)

(Urdu Compulsory)

Subject Code : UBA 2.6

© UNIVERSITY OF MUMBAI

© یونیورسٹی آف ممبئی

پروفیسر سہاس پیڈنیکر

وائس چانسلر

یونیورسٹی آف ممبئی

پروفیسر رویندر کلکرنی

پرو۔وائس چانسلر

یونیورسٹی آف ممبئی

پروفیسر پرکاش مہانور

ڈائرکٹر

فاصلاتی تعلیمی ادارہ(IDOL)، یونیورسٹی آف ممبئی

پروگرام کوآرڈینٹر : **ڈاکٹر انل بنکر**

صدر، فیکلٹی آف ہیومینیٹیز

فاصلاتی تعلیمی ادارہ(IDOL)، یونیورسٹی آف ممبئی

کورس رابطہ کار و مدیر : **ڈاکٹر معزہ (قاضی) دلوی**

فاصلاتی تعلیمی ادارہ(IDOL)، یونیورسٹی آف ممبئی

مضمون نگار :

ڈاکٹر مزمل سرکھوت **(اکائی:1)**

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ممبئی

ڈاکٹر کہکشاں لطیف **(اکائی:2)**

اسسٹنٹ پروفیسر، ڈیپارٹمنٹ آف ٹرانسلیشنز

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔

ڈاکٹر معزہ قاضی **(اکائی:3)**

سابق اسوسی ایٹ پروفیسر و صدر

شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ممبئی

ڈاکٹر بی بی رضا خاتون **(اکائی:4)**

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

ڈاکٹر نصر اللہ خان **(اکائی:5)**

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ پی۔جی اسٹڈیز و تحقیق (اردو)

کویمپو یونیورسٹی، کرناٹک

ڈاکٹر نصر اللہ خان **(اکائی:6)**

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ پی۔جی اسٹڈیز و تحقیق (اردو)

کویمپو یونیورسٹی، کرناٹک

ڈاکٹر کہکشاں لطیف **(اکائی:7)**

اسسٹنٹ پروفیسر، ڈیپارٹمنٹ آف ٹرانسلیشنز

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔

ڈاکٹر ماجد قاضی **(اکائی:8)**

اسوسی ایٹ پروفیسر،

صدر، شعبہ اُردو، مہاراشٹر کالج ممبئی

جنوری 2021 **طباعت۔I**

پبلشر : ڈائرکٹر،

فاصلاتی تعلیمی ادارہ(IDOL)، یونیورسٹی آف ممبئی

ماہر طباعت و ٹائپسٹ : جناب عبدالمنان فہیم احمد شیخ

پرنٹر : ممبئی یونیورسٹی پریس

نصاب

(حصہ اول)

اکائی 1 : رپورٹ نگاری اور محاورے

اکائی 2 : محمد حسین آزاد، قرۃ العین حیدر، سید احتشام حسین

اکائی 3 : یوسف ناظم، مشتاق احمد یوسفی، پروفیسر نورالعین علی

اکائی 4 : فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، اختر الایمان

اکائی 5 : ساحر لدھیانوی، سکندر علی وجد، ن۔م۔راشد

اکائی 6 : حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری

اکائی 7 : مجروح سلطان پوری، ناصر کاظمی، معین احسن جذبی

اکائی 8 : جگت موہن لال رواں، مرزا دبیر

نمونہ امتحانی سوالیہ پرچہ

کل نمبرات: ۱۰۰ وقت: ۳ گھنٹے

تمام سوالات لازمی ہیں۔

ہر سوال کے نمبر اس کے سامنے دیے گئے ہیں۔

سوال نمبر ۱: (الف) رپورٹ نگاری پر مشتمل متبادل سوالوں میں سے کسی ایک سوال کا جواب لکھنا ہوگا۔ (10)
(ب) دیے گئے محاوروں میں سے کوئی پانچ محاوروں کی معنی لکھ کر جملوں میں استعمال کرنا ہوگا۔ (10)

سوال نمبر ۲: نثر نگاروں پر مشتمل متبادل سوالوں میں سے ایک سوال کا تفصیلی جواب لکھنا ہوگا۔ (20)

سوال نمبر ۳: نظم/غزل گو شعرا پر مشتمل متبادل سوالوں میں سے ایک سوال کا تفصیلی جواب لکھنا ہوگا۔ (20)

سوال نمبر ۴: (الف) دیے گئے نثری عنوانات میں سے کسی ایک عنوان پر تفصیلی گفتگو کرنی ہوگی۔ (10)
(ب) نظم کے عنوانات میں سے کسی ایک نظم کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ (10)

سوال نمبر ۵: (الف) دیے گئے چار اقتباسات میں سے کوئی دو اقتباسات کی سیاق وسباق کے حوالے سے وضاحت کرنی ہوگی۔ (10)
(ب) دیے گئے تین اشعار میں سے کسی ایک شعر کی تشریح مع شاعر کے نام۔ (05)

(ب) دیے گئے تین بند میں سے کسی ایک بند کی مع سیاق وسباق تشریح۔ (05)

☆☆☆

اکائی۔ 1: رپورٹ نگاری اور محاورے

ساخت:

1.1۔مقصد

1.2۔تمہید

1.3۔رپورٹ نگاری کی تعریف

1.4۔صحافت میں رپورٹ نگاری کی اہمیت

1.5۔رپورٹ نگاری کی چند مثالیں

1.6۔محاورے

1.7۔مشقی محاورے

1.8۔خلاصہ

1.9۔نمونہ امتحانی سوالات

1.10۔فرہنگ

1.11۔معاون کتابیں

1.1 مقصد

صحافت کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جمہوریت میں صحافت کو چوتھا ستون کہا جاتا ہے جو عوام کو باخبر رکھنے کا فرض نبھاتا ہے۔ رپورٹ نگاری صحافت کی ایک شاخ ہے جس سے واقفیت صحافت کو سمجھنے میں معاون ہوگی۔ طلبا اپنے اطراف ہونے والے واقعات اور حادثات سے رپورٹ نگاری کے ذریعے ہی آگاہ ہوتے ہیں، لہٰذا انھیں رپورٹ نگاری کو سمجھنے اور مستقبل میں صحافت میں بطور پیشہ کار کے اپنی خدمات انجام دینے کے مواقع کی صورت میں ماقبل تیاری اس اکائی کا مقصد ہے۔

1.2 تمہید

رپورٹ سرکاری ملاقاتوں، دفتروں، مجلسوں کی بھی ہوسکتی ہے، رپورٹ انفرادی کاموں کی بھی ہوسکتی ہے اور رپورٹ پولیس میں درج کیے جانے والی شکایت کی بھی ہوسکتی ہے، لیکن اس اکائی میں جس رپورٹ نگاری پر لکھنا مقصود ہے وہ اردو صحافت سے تعلق رکھنے والی رپورٹ نگاری ہے جس کے بغیر صحافت کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔

1.3 رپورٹ نگاری کی تعریف

رپورٹ انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کی معنی تحقیقی دستاویز، اطلاع، وضاحت بیان کرنا، بیان دینا، آگاہ کرنا، خبر دینا، اطلاع دینا، رائے وغیرہ مراد لی جاتی ہے۔ انگریزی کا یہ لفظ اردو میں رچ بس گیا ہے اور ''رپورٹ کرنا'' اور ''رپورٹ دینا'' عام محاورے ہوگئے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں اس لفظ کا استعمال بلا روک ٹوک کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے نصاب میں اس لفظ کے ساتھ ایک اور لفظ جڑا ہے جس نے اسے انفرادیت عطا کردی ہے، وہ لفظ ہے لاحقہ'' نگاری'' جو نگارش سے بنا ہے جس کی معنی تحریر کے ہوتے ہیں۔ تو ہمارے نصاب کے اس مکمل لفظ ''رپورٹ نگاری'' کی معنی ''رپورٹ لکھنا'' ہوگی۔ اور رپورٹ لکھنے سے مراد یا تو پولیس میں شکایت درج کرنا ہوتا ہے یا تو اخبار یا ٹیلی ویژن کے لیے خبر جمع کر کے تحقیقی دستاویز کی صورت لکھنا ہوتا ہے۔ پولیس شکایت سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ تب لامحالہ ہمارا پالا پڑے گا صحافت سے، اخبار سے یا ٹیلی ویژن سے۔ ہماری رپورٹ نگاری کا تعلق صحافت سے ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

١۔ رپورٹ نگاری کس علم کی شاخ ہے؟

٢۔ اطراف کے حالات اور واقعات سے ہم کس کے ذریعے آگاہ رہتے ہیں؟

٣۔ رپورٹ کس زبان کا لفظ ہے؟

٤۔ رپورٹ نگاری کی معنی کیا ہے؟

1.4 صحافت میں رپورٹ نگاری کی اہمیت

صحافت میں مختلف شعبے متحرک ہوتے ہیں۔ ادارتی شعبہ، اشتہاراتی شعبہ، فیچر نگاری کا شعبہ، طباعت کا شعبہ، اقتصادیات کا شعبہ، رپورٹ نگاری کا شعبہ وغیرہ۔ رپورٹ نگاری کا شعبہ ان سب میں زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ کسی اخبار کی کھپت یا اس کے زیادہ پڑھنے کی وجوہات میں ایک بڑی وجہ اس کی رپورٹ نگاری ہوتی ہے۔ رپورٹ نگاری اخبار کی جان ہوا کرتی ہے۔ کوئی واقعہ، حادثہ، کوئی حیران کن فیصلہ، کوئی زلزلہ، کوئی تباہی، کوئی خوشی، کوئی کامیابی، کوئی جیت، کوئی ہار اور اسی طرح بے شمار باتیں دنیا میں وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ ہمیں اخباروں کے ذریعے ان کی اطلاع ہوتی رہتی ہے۔ اخبار میں یہ رپورٹیں ہی ہوتی ہیں جو دنیا کی اچھی بری خبروں سے ہمیں آگاہ کرتی ہیں۔ کوئی حکومت انتخابات ہار جاتی ہے اور حزب اختلاف انتخابات میں جیت درج کرتی ہے، یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہوتی مگر رپورٹ نگار اس چھوٹی سی بات کو مختلف زاویوں سے بیان کرتا ہے، وہ نہ صرف جیت اور ہار کی اطلاع دینے کے بعد خاموش ہو کر بیٹھتا ہے، بلکہ وہ دونوں طرف سے رہنماؤں سے ان کے ردعمل جاننے کی کوشش کرتا ہے، جیت کی وجہ اور ہار کا سبب دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے، سیاسی ماہرین سے رجوع ہوتا ہے، ان سے اس جیت اور ہار کی نئی معنی جاننا چاہتا ہے اور آخر میں اپنی بات بھی کہہ دیتا ہے۔ رپورٹ نگار یہ ساری محنت صرف اس لیے کرتا ہے کہ اس کے قارئین جزیات سے بھی واقف ہو جائیں، وہ باخبر رہیں کہ یہ جو ہو رہا ہے اس کا ان کی زندگی پر کیا اثر ہو رہا ہے اور کیا ہوگا۔

کسی واقعہ کو اہم اور غیر اہم کے فرق میں سمجھنا اور حسب حال اسے سمجھانا، اس کے واقع ہونے کے اسباب وعلل پر روشنی ڈالنا، اس کے مثبت ومنفی اثرات کو نمایاں کرنا، مستقبل کے پیش نظر اس کے امکانات کو ظاہر کرنا، ماضی کو مدنظر رکھ کر اس کے نقصان سے حفاظت کی تدابیر بتانا جیسی نہایت اہم باتیں ایک اچھی رپورٹنگ میں شامل ہوتی ہیں۔ اخبار یا ٹیلی ویژن کی ساکھ رپورٹر کی رپورٹنگ پر مبنی ہوتی ہے۔ ایک واقف کار اور سمجھدار رپورٹر نہ صرف یہ کہ وہ عوامی شعور کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہوتا ہے بلکہ اخبار کے لیے بھی فائدہ مند ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ایک کاہل، سست یا خراب رپورٹر نہ صرف نیم حکیم ثابت ہو سکتا ہے بلکہ اخبار اور عوام کے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔

معلومات اور عوام کے درمیان کی دوری کو پاٹنے کا اہم کام رپورٹر کے ذمہ ہوتا ہے۔ حکومت کے عوامی فیصلوں میں عوام کا فائدہ سوچا ہوا ہے یا صرف ساہوکاروں پر سرکار نے نظر کرم کیا ہوا ہے؟ سرکار کی پالیسیاں عوام دوست ہیں یا نہیں؟ سرکار کی عوامی اسکیمیں ملک کے تمام طبقات تک پہنچ رہی ہیں یا نہیں؟ ان تمام نکات کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتے ہوئے رپورٹنگ کرنا رپورٹر کا فرض ہوتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے رپورٹر جانب داری سے کام نہیں لے سکتا، چاہے اس پر سرکار کتنا ہی دباؤ بنائے۔ رپورٹر کا کام ہے کہ اپنے جان کی پروا کیے بنا سچائی کو طشت از بام کرنا۔ رپورٹر کسی لالچ یا

دھمکی سے حقیقت کو چھپانے کا گناہ نہیں کرسکتا۔صحافت کی مکمل عمارت رپورٹر یا صحافی کی غیر متعصب اور غیر جانب دار رپورٹنگ پر ٹکی ہوتی ہے،جس وقت عمارت کا یہ سب سے اہم حصہ شکستہ ہوجاتا ہےعمارت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوجاتی ہے۔ کئی ممالک میں صحافی سرکار کے نمائندے کے طور پرعوام کوان خبروں سے آگاہ کرتے جن کوخود سرکار چاہتی ہے کہ یہ خبریں مشتہر ہوجائیں،اور جن خبروں سے سرکار کی غلط شبیہہ بننے والی ہو،وہ خبریں چاہےعوام کے لیےکتنی ہی لازمی کیوں نہ ہوں وہ چھپائی جاتی ہیں۔

صرف ملک کی اہم خبروں سے ہی واقف ہوناعوام کے لیےضروری نہیں ہے بلکہ عالمگیریت کی وجہ سے دنیا سمٹتی جارہی ہےاورایک ملک سے دوسرے ملک کے روابط کےتعلق سےمعلومات ہونا بھی ضروری ہوگیا ہے،ایسی معلومات کو’’ بین الاقوامی معلومات‘‘ کہتے ہیں۔آس پاس کیا ہورہا ہے؟ کیا تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں؟ دنیا میں کون سی نئی ایجادات ہنگامہ مچارہی ہیں؟معلومات کا وسیع خزانہ موجود ہے جسے رپورٹنگ کے ذریعےعوام تک پہنچانا صحافت کی اخلاقی اوراساسی ذمہ داری ہوتی ہے۔اپنی عوام کواور قارئین یا ناظرین کو باخبر رکھنے،انھیں بدلتی دنیا کے ساتھ چلنے کے قابل بنانے کے لیے صحافت کوایک رہبر کا کردارادا کرنا ہوتا ہے۔

جمہوریت میں صحافت ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتا ہے۔اس لیے جمہوریت کی بقااوراس کےصحت مند بنے رہنے کے لیے صحافت کوآزاد اور غیر جانب دار رہنا ضروری ہے۔رپورٹ نگاری صحافت کی جان ہوتی ہے۔جس طرح جمہوریت کی بقا اورعوامی حقوق کی پاسداری ضروری ہے اسی طرح صحافت میں رپورٹ نگاری کی شفافیت لازمی ہے۔ رپورٹ نگاری کاروبار کےتعلق سے ہوسکتی ہے،رپورٹ نگاری سیاسی اٹھا پٹخ کی ہوسکتی ہے،رپورٹ نگاری کھیلوں سے وابستہ ہوسکتی ہے،سنیما کی ہوسکتی ہےاور دیگر شعبہ ہائے حیات سے وابستہ بھی ہوسکتی ہے۔ ہر شعبہ حیات سے وابستہ شخص اخبار یا ٹیلی ویژن میں اپنی پسند کی رپورٹ نگاری کودلچسپی اور دلجمعی کے ساتھ پڑھتا اور دیکھتا ہے۔لہٰذا رپورٹ نگار کی ذمہ اریاں بڑھ جاتی ہیں۔مختلف شعبہ جات کے لیےمختلف رپورٹ نگار کی روش بھی کامیاب رہی ہے،جیسے معاشی اوراقتصادی رپورٹنگ کے لیے اسی شعبے سے وابستہ شخص کومتعین کیا جاتا ہے،کھیلوں میں دلچسپی رکھنے والےنمائندوں کوکھیلوں کی خبروں کے لیےمختص کیا جاتا ہے،تعلیمی خبروں کے لیےتعلیم سے وابستہ اشخاص کی رائے لینا پسند کیا جاتا ہے۔اس رجحان نے صحافت کی ترقی کی رفتار بڑھادی ہےتو دوسری طرف معلومات کےچھَن کرآنے کےعمل کومزید شفاف بنادیا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ ’’بین الاقوامی معلومات‘‘ سے کیا مراد ہے؟

۲۔ صحافت کے اہم شعبے کون سے ہیں؟

۳۔ اخبار کی کھپت کی ایک وجہ کیا ہے؟

۴۔ اخبار یا ٹیلی ویژن کی ساکھ کس پر مبنی ہوتی ہے؟

1.5 رپورٹ نگاری کی چند مثالیں

۱۔ جیل میں بھیما کوریگاؤں کیس کے ملزمین کی بھوک ہڑتال

ممبئی (ایجنسی): قید کے دوران اسپتال میں فوت ہوجانے والے فادر اسٹین سوامی کی موت کو’’ادارہ جاتی قتل‘‘ قرار دیتے ہوئے بھیما کورے گاؤں کے یلغار پریشد کیس کے ۱۰ ملزمین نے بدھ کو جیل میں احتجاجاً ایک دن کی بھوک ہڑتال کی ہے۔انھوں نے معاملے کی جانچ کرنے والی این آئی اے کے افسران اور تلوجہ جیل کے سابق سپرنٹنڈنٹ کے خلاف کاروائی کی بھی مانگ کی ہے۔

جیل کے باہر سماجی انصاف کے لیے بنائی گئی جوائنٹ ایکشن کمیٹی اور بھیما کورے گاؤں شوریہ دوس پریرنا ابھیان نے احتجاج کیا اور الزام لگایا کہ ملک میں اختلافی آوازوں کو دبانے کی ایک منصوبہ بند سازش پر عمل ہورہا ہے۔(روزنامہ انقلاب ممبئی ۸ جولائی ۲۰۲۱ء)

۲۔ دل نے جسے پایا تھا آنکھوں نے گنوادیا:

سنیما کی دیومالائی شخصیت ،شہنشاہ جذبات دلیپ کمار سب کو روتا بلکتا چھوڑ گئے ۔ پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ جوہو قبرستان میں تدفین، ملک بھر میں غم کی لہر، بے شمار تعزیتی پیغامات

سعید احمد خان

saeedk@mid-day.com

ممبئی: ہندی سنیما کی دیومالائی شخصیت ،شہنشاہ جذبات دلیپ کمار عرف یوسف خان، جنھوں نے اپنی اداکاری سے سنیما کو وقار بخشا، کا آج طویل علالت کے بعد بدھ کی صبح ۔۔۔اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ ۹۸ سال کے تھے۔کئی دہائیوں سے فلم شائقین کے دلوں پر راج کرنے والے دلیپ کمار کے انتقال کے بعد ان کے مداحوں میں غم کی

لہر دوڑ گئی۔ پسماندگان میں بیوی سائرہ بانو ہیں۔ ریاستی حکومت کے اعلان کے مطابقان کی تدفین سرکاری اعزاز کے ساتھ سانتا کروز کے جوہو قبرستان میں سہ پہر سوا چار بجے عمل میں آئی۔

خراج عقیدت پیش کرنے والوں کا تانتا بند گیا

دلیپ کمار کو سانس لینے میں تکلیف کے باعث گزشتہ منگل کو مہینے بھر میں دوسری بار اسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ بدھ کی صبح ۷ بج کر ۳۰ منٹ پر انھوں نے آخری سانس لی۔اس کی اطلاع ان کے معالج ڈاکٹر جلیل پرکار نے دی۔ساڑھے نو بجے ان کا جسد خاکی پالی ہل میں ان کی رہاش گاہ پر لے جایا گیا جہاں انھیں خراج عقیدت پیش کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ان میں ان کے دوست احباب،اعزہ،ساتھی اورنئ نسل کے اداکار شامل تھے۔خود کو دلیپ کمار کا سب سے بڑا مداح کہنے والے دھرمیندر مرحوم کے سرہانے بیٹھ کر کافی دیر تک آنسو بہاتے رہے۔ان کے علاوہ شبانہ اعظمی،شاہ رخ خان اور ریاست کے وزیراعلیٰ ادھوٹھا کرے،این سی پی سربراہ شرد پوار،آدتیہ ٹھاکرے اور نواب ملک بھی رہائش گاہ پہنچ کر خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں شامل تھے۔دھرمیندر سے دلیپ کمار کے گھر کے باہر موجود میڈیا کے نمائندوں نے جب گفتگو کرنے کی کوشش کی تو انھوں نے جواب دیا کہ ”میں آج بہت غمزدہ ہوں۔ مجھ میں کچھ بولنے کی سکت نہیں ہے۔میں نے اپنا بھائی کھویا ہے۔“

۱۹۴۴ء میں فلمی سفر کا آغاز کیا

۱۹۴۴ء میں بامبے ٹاکیز کی فلم جوار بھاٹا سے اپنے فلمی کیریر کا آغاز کرنے والے دلیپ کمار نے ۶ دہائیوں تک نہ صرف ہندی فلم انڈسٹری پر راج کیا بلکہ بڑے چہیتے فلم اسٹار بن کرا بھرے۔دیوداس،مغل اعظم،گنگا جمنا،رام اور شیام،بیراگ،شکتی،ودھاتا اور سوداگر جیسی درجنوں فلموں میں ان کی اداکاری نے ہر خاص وعام کو متاثر کیا۔دلیپ کمار کو ایک اداکار سے زیادہ اداکاری کے اسکول کے طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔تجہیز وتکفین کے بعد ان کے جسد خاکی کو قومی پرچم میں لپیٹ کر گارڈ آف آنر پیش کیا گیا۔

بنگلے پر ہی نماز جنازہ ادا کی گئی

دلیپ کمار کی نماز جنازہ ان کے بنگلے پر ہی تین بجے ادا کی گئی جس کی امامت مولانا محمد طارق مرادآبادی نے کی۔مولانا طارق دلیپ کمار کے بنگلے پر ۱۷ برس سے امامت اور مختلف مواقع پر خطابت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد بھی کورونا کا حوالہ دیتے ہوئے بھیڑ بھاڑ نہ ہواس کا خیال رکھنے کے لیے باقاعدہ اعلان کیا گیا۔

دلیپ کمار کینسر سے متاثر تھے

دلیپ کمار جو ہندوستانی سنیما کے سنہرے دور کے آخری بقید حیات فلمی ستاروں میں سے تھے، گزشتہ کچھ برسو سے مسلسل علیل تھے۔ انھیں پروسٹیٹ کینسر اور پھیپھڑوں کا عارضہ لاحق تھا جس کی وجہ سے انھیں وقفے وقفے سے اسپتال داخل کرنا پڑتا تھا۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۲۲ء کو پشاور میں آنکھیں کھولنے والے دلیپ کمار کے انتقال کے بعد خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں صدر جمہوریہ رام ناتھ کووند، وزیر اعظم نریندر مودی، وزیر داخلہ امیت شاہ، تمام ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ اور ملک کی ممتاز شخصیات شامل ہیں۔

ہندوستانی ثقافت کا نقصان

رام ناتھ کووند نے اپنی تعزیتی پیغام میں کہا کہ ''دلیپ صاحب اپنے آپ میں ابھرتے ہوئے ہندوستان کی مکمل تاریخ تھے۔ ان کے چاہنے والے سرحد کے دونوں طرف موجود ہیں۔'' انھوں نے مزید لکھا کہ ''ان کی موت کے ساتھ ہی ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ وہ ہندوستانیوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔'' وزیر اعظم نریندر مودی نے اپنے تعزیتی پیغام میں دلیپ کمار کی موت کو ہندوستانی ثقافت کا نقصان قرار دیا۔ انھوں نے ٹویٹ کیا کہ ''دلیپ صاحب کو فلمی دنیا کی دیومالائی شخصیت (لیجنڈ) کے طور پر ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ وہ غیر معمولی ذہانت کے حامل تھے۔ ان کے شائقین کئی نسلوں میں موجود ہیں۔ ان کا انتقال ثقافتی دنیا کا نقصان ہے۔'' راہل گاندھی نے اپنے پیغام میں کہا کہ دلیپ کمار کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ (روزنامہ انقلاب ممبئی ۸ جولائی ۲۰۲۱ء)

۳۔ کوپا امریکہ فائنل: نیمار بمقابلہ لیونل میسی

اتوار کی علی الصبح دو مضبوط ٹیمیں مارا کانا اسٹیڈیم میں آمنے سامنے ہوں گی۔ برازیل کے نیمار اور میسی میں براہ راست ٹکر ریوڈی جنیرہ (ایجنسی): کوپا امریکہ کے فائنل میں شائقین برازیل اور ارجنٹائنا سے زیادہ نیمار اور لیونل میسی میں مقابلے کو دیکھنا پسند کریں گے۔ اتوار کو علی الصبح ساڑھے پانچ بجے یہاں کے تاریخی مارا کانا اسٹیڈیم میں جنوبی امریکہ دو فٹبال پاور ہاؤس برازیل اور ارجنٹائنا کے درمیان کوپا امریکہ کے خطاب کے لیے جنگ ہوگی۔

یہ مقابلہ دنیا کے مضبوط کھلاڑیوں لیونل میسی اور نیمار کے درمیان ہوگا جو کبھی بارسلونا میں ایک ساتھ کھیل چکے ہیں۔ یہ مقابلہ دنیا کی بہترین دفاعی صف رکھنے والی ارجنٹائنا کی ٹیم کا ہوگا جو دنیا کے بہترین اسٹرائکر دنیامر کو روکنے کے لیے تیار ہوگی۔ اس ٹورنامینٹ میں نیمار نے اب تک صرف ۲ گول کیے ہیں جبکہ میسی نے ۴ گول کیے ہیں۔ خیال رہے کہ ٹورنامینٹ کے آغاز میں برازیل کے کھلاڑیوں نے کوپا امریکہ کو اچانک ارجنٹائنا سے برازیل منتقل کرنے پر برہمی کا

اظہار کیا تھا اور کنفیڈریشن پر تنقید بھی کی تھی لیکن اس کے کھلاڑیوں نے اچھا کھیل کھیلتے ہوئے فائنل میں جگہ بنائی اور اب ان کھلاڑیوں نے اپنا مقصد تبدیل کرتے ہوئے خطاب جیتنے کا فیصلہ کیا ہے۔

دوسری طرف ارجنٹائنا کے کپتان لیونل میسی کے لیے یہ میچ بہت اہم ہوگا کیوں کہ انھوں نے بارسلونا فٹبال کلب کی جانب سے ۲۸ خطاب جیتے ہیں لیکن وہ اپنی قومی ٹیم کے لیے اب تک کوئی بڑا خطاب نہیں جیت سکے ہیں۔ وہ ۳ بار کوپا امریکہ کے فائنل میں مقابلہ کر چکے ہیں لیکن ہر بار ناکام رہے ہیں۔ اس بار ان کی ٹیم چاہے گی کہ وہ اپنے کپتان کو جیت کا تحفہ دے۔ ارجنٹائنا کے کپتان نے اس بار کوپا امریکہ میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور ۴ گول کرنے کے ساتھ ۵ گول کرنے میں دیگر کھلاڑیوں کی مدد بھی کی ہے۔ حالانکہ دونوں ٹیموں کا پلڑا بھاری ہے اور اتوار کی علی الصبح ایک مضبوط مقابلہ دیکھنے کو ملے گا۔ (روزنامہ انقلاب ممبئی ۱۰ جولائی ۲۰۲۱ء)

1.6 محاورے

مستند لغت ''فرہنگ آصفیہ'' میں محاورے کی ایک معنی ہم کلامی، باہمی گفتگو، بول چال، بات چیت، سوال جواب دیا ہے اور دوسری یعنی اصطلاحی معنی وہ کلمہ یا کلام جسے چند ثقات نے لغوی معنی کی مناسبت یا غیر مناسبت سے کسی خاص معنی کے واسطے مختص کر لیا ہو، دیا ہوا ہے۔

دو یا اس سے زیادہ لفظوں کا وہ مجموعہ جو مصدر سے مل کر، اپنے حقیقی معنی سے ہٹ کر مجازی معنی میں بولا یا استعمال کیا جاتا ہے محاورہ کہلاتا ہے۔ محاورے زبان کو چست اور جاندار بنانے میں مدد و معاون ہوتے ہیں۔ محاوروں کو زبان کا ذائقہ سمجھا جاتا ہے۔ زبان کی لذت کا احساس محاوروں سے ہوتا ہے۔ محاورے بننے کا عمل غیر محسوس طور پر جاری رہتا ہے۔ محاورے جن لفظیات میں ملبوس ہوتے ہیں، بظاہر معنی ان سے مختلف یا ماورا رکھتے ہیں۔ محاوروں کی بنیاد عوام کے درمیان واقعات، تجربات اور حادثات سے پڑتی ہے۔ محاورہ دو یا دو سے زیادہ لفظوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ محاورے میں استعمال ہونے والے الفاظ اپنی اصل معنی کے علاوہ دوسرے مفہوم کے لیے بھی آزاد ہوتے ہیں۔ جیسے ''دل باغ باغ ہونا''، یہ محاورہ لغوی اعتبار سے جس منظر کی نشان دہی کرتا ہے اس جانب ہماری توجہ فوراً ملتفت ہوتی ہے مگر محاورے میں اس کا مطلب مختلف ہوگا۔ جب کوئی محاورہ تخلیق ہوتا ہے اور اس کا چلن شروع ہو جاتا ہے، اسے اعتبار حاصل ہو جاتا ہے تب اس کے الفاظ میں ردو بدل نہیں کیے جا سکتے۔ ان کو جیوں کا تیوں استعمال میں لانا ہوتا ہے۔ جیسے ''پاؤں بھاری ہونا''۔ یہاں ''پاؤں'' کے علاوہ کسی اور جسمانی عضو کا استعمال محاورے کی معنی بدل دے گا۔ گنتی کے محاورے میں ''دو دو ہاتھ ہو جانا''، یہاں بھی تعداد بدلنا ممکن نہیں۔ دو کی جگہ تین نہیں لکھا جا سکتا اور نا ہی جملے میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

محاورے زندگی کے تقریباً ہر شعبہ ہائے حیات سے منسلک وضع کیے گئے، نیز کارخانہ قدرت کی نسبتاً ہر شئے محاوروں کی زد میں آئی ہے۔ مردوں سے مخصوص محاورے، عورتوں سے متعلق محاورے، اعضائے جسمانی کے محاورے، نباتات سے منسلک محاورے، جانوروں (پالتو اور جنگلی) سے متعلق محاورے، پرندوں کے محاورے، آسمانی دنیا کے محاورے، زمین سے جڑے محاورے، علم طب سے متعلق محاورے، علم نفسیات سے منسلک محاورے، جسمانی ساخت کو ظاہر کرتے ہوئے محاورے، سونے سے متعلق محاورے، بیداری کے محاورے، پانی کے تعلق سے محاورے وغیرہ وغیرہ محاورے روزمرہ زندگی میں استعمال ہوتے ہیں اور نہ صرف زبان میں مٹھاس گھول دیتے ہیں بلکہ تجربات سے آگاہ بھی کرتے ہیں۔

زبان اظہار خیال کا ذریعہ ہے۔ خیال مثبت بھی ہوسکتا ہے منفی بھی۔ چونکہ محاورے زبان کے بدن پر ملبوس ہوتے ہیں، لہٰذا یہ بھی مثبت اور منفی اثرات کے غماز ہوتے ہیں۔ نیز انکاری، اقراری اور استعجابی محاورے بھی چلن میں ہوتے ہیں۔ طربیہ اور رزمیہ معنوی ساخت کے محاورے بھی تقریباً ہر زبان میں پائے جاتے ہیں۔ طنزیہ اور مزاحیہ نوعیت کے محاوروں کا بھی اپنا مقام ہے۔ مختلف جذبات کی نمائندگی کرنے والے متعدد محاورے زبان کی چاشنی میں اضافہ کرتے ہیں۔ خاموشی کو ظاہر کرنے والے محاورے، شور کے متعلق محاورے، غصے کو ظاہر کرنے والے محاورے، خوشی کو ظاہر کرنے والے محاورے، غم کے اظہار کے محاورے، رشتوں کے محاورے، کاروبار کے محاورے، کھیل وتفریح کے محاورے۔ غرض محاوروں کی ابدی زندگی کے لیے بیشمار مواقع دستیاب ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ کسی ایک مستند لغت کا نام لکھیے۔

۲۔ محاورے کی معنی کیا ہے؟

۳۔ زبان کا ذائقہ کسے کہا جاتا ہے؟

۴۔ زبان کو چست اور جاندار بنانے میں معاون کیا ہوتا ہے؟

۵۔ اظہار خیال کا ایک ذریعہ کون سا ہے؟

1.7 مشقی محاورے

ذیل میں ہم مختلف نوعیت کے مختلف محاوروں کو سمجھنے اوران کو جملوں میں استعمال کرنے کی مشق کریں گے۔

طوفان باندھنا: کسی بات کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرنا، الزام لگانا، بدنام کرنا

بیت: ؎ ہم نے رونے کا بھلا کب سروساماں باندھا تم نے ہے دیدہ ودانستہ یہ طوفاں باندھا

نثر: پٹرول کی بڑھتی قیمتوں پر طوفان باندھنے والی حزب اختلاف جب اقتدار پر براجمان ہوئی تو اس نے سب سے پہلے پٹرول کے داموں میں اضافہ کو نئی تیزی دی۔اب ملک میں پٹرول کے دام اس قدر بڑھا دیے گئے ہیں کہ وہ ملک کی آدھی آبادی کے لیے ناقابل برداشت ہوگیا ہے۔لوگ پٹرول والی گاڑیاں گیراج میں بند کررہے ہیں۔

نوش جان کرنا: تناول فرمانا، کھانا

بیت: ؎ نہ رہتا ایک قطرہ بھی سبوئے عشق میں باقی جو کرتے نوشِ جاں زہراب غم پہلے سے ہم پہلے

نثر: ''نواب صاحب ظہرانے میں قورمہ نوش جان کر کے قیلولہ کے لیے چلے گئے ہیں اب ملاقات ممکن نہیں۔آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔'' نواب صاحب سے ملاقات کے لیے آنے والے ایک وفد کو دربان نے اطلاع دی۔

ہرن ہوجانا: ہرن کی طرح جلدی بھاگ جانا، فرار ہوجانا، جاتا رہنا

بیت: ؎ پھر ہرن ہوگئی مری وحشت پھر وہ رعنا غزال آ پہنچا

نثر: شراب کے زیادہ پی لینے سے امیت بہکنے لگا تھا۔کار کو بے ترتیبی سے چلائے جارہا تھا۔اچانک اسے اپنے پیچھے ہارن سنائی دیا۔اس نے آئینے میں دیکھا تو ٹرافک پولیس کی سواری تھی۔پولیس اسے رکنے کے لیے کہہ رہی تھی۔بالآخر پولیس نے اسے روک لیا۔تلاشی اور پوچھ تاچھ میں پتہ چلا کہ امیت کے پاس اس وقت لائسنس نہیں تھا، وہ شراب پی کر گاڑی چلا رہا تھا، ٹرافک کے کئی قوانین کو توڑ چکا تھا۔پولیس نے اس کے خلاف کئی شکایتیں درج کیں۔ایک لمبی چوڑی لسٹ اس کے ہاتھ میں تھما دی گئی کہ یہ چالان ہے جو اسے ادا کرنا ہے ورنہ جیل جانا پڑ سکتا ہے۔چالان دیکھ کر امیت کا نشہ ہرن ہوگیا۔وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پا سکا تھا۔اب وہ ٹرافک پولیس سے منت سماجت کررہا تھا کہ اس کی غلطی کو معاف کیا جائے۔بحث جاری تھی۔

وصال ہونا: ملاقات ہونا،صحبت ہونا،وفات پانا

بیت: ؎ وصالِ یار کی فرقت میں آرزو تھی مجھے اسی فراق میں آخر مرا وصال ہوا

نثر: فراق میں تڑپتے عاشق ومعشوق جب وصال کے ہونے کی خبر سنتے ہیں اس وقت ان کی جو کیفیت ہوتی ہے اس میں مترنم جذبات تہلکہ مچارہے ہوتے ہیں، اچانک ہجر کا طویل دورانیہ مختصر مدت محسوس ہونے لگتا ہے۔

نقش دیوار بنا رہنا: حیرت زدہ رہنا، بےحس وحرکت ہونا

بیت: ؎ آج کس آن میں تصویر نے دیکھا تھا مجھے نقش دیوار ہوا محوِ تماشا ہوکر

نثر: تاج محل کے تعلق سے افسانوی باتیں سنی بہت تھیں مگراب کی بار جب اسے اپنے سامنے دیکھا تو نقش دیوار بن گیا، اس کی منفرد تعمیری شناخت اور جذبات سے وابستہ اس کا وجود اتھاہ گہرائیوں میں غرق کرگیا۔

منہ کھل جانا: منہ پھٹ ہوجانا، گستاخی کی عادت ہوجانا، بدزبان ہوجانا

بیت: ؎ بے زبانی باتیں سنوانے لگی گالیوں پر منہ تمہارا کھل گیا

نثر: رئیس جی نے اپنے سابق نوکر کے تعلق سے کہا کہ شروعات میں وہ بہت خاموش مزاج اور باادب تھا۔ پھر پتہ نہیں اسے کیا ہوگیا، اس کا منہ کھل گیا تھا۔ کسی سے بھی سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ حتٰی کہ اس کی بدزبانی سے گھر کی خواتین بھی محفوظ نہیں رہ پائی تھیں۔ مجبوراً اسے نوکری سے نکالنا پڑا۔

منہ توڑ جواب دینا: بےلاگ جواب دینا، بےباکی کے ساتھ جواب دینا، صاف صاف بات کہنا

بیت: ؎ وہ جو ہر بات میں منہ توڑ کے دیتا ہے جواب اس کے آگے نہیں پڑتا مرے غم خوار کا منہ

نثر: کافی تیکھی بحث ہورہی تھی۔ وزیر صاحب صحافی کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے غلط سلط باتیں زور وشور سے سناتے جارہے تھے، لیکن صحافی اپنا ہوم ورک کرکے آیا تھا اس نے وزیر صاحب کے ہر وار کا جواب دیا، منہ توڑ جواب۔ اور انھیں منطقی سوالات کے گھیرے میں لے لیا۔ وزیر صاحب کو جواب دیتے نہیں بن پارہا تھا، چنانچہ وہ پریس کانفرنس سے اٹھ کر چلے گئے۔

1.8 خلاصہ

واقعہ کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر اسے بیان کرنا اچھی رپورٹنگ کی نشانی ہوتی ہے۔ رپورٹ نگار پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی رپورٹ سے قارئین اور عوام کو کتنا باخبر کر پاتا ہے، کس قدر ان کے حقوق سے انھیں واقف کراتا ہے۔ سرکار کی جانب سے متعارف اور نافذ کی جانے والی اسکیمیں، عوامی زندگی پر اثر انداز ہونے والی، اطراف واکناف کی انتہائی اہم معلومات، دنیا کی خبریں، سائنس کی خبریں، تعلیم کی خبریں، کھیلوں کی خبریں، سیر وسیاحت کی خبریں، تفریح کی خبریں، سیاسی خبریں جیسی متعدد اور مختلف معلومات کے لیے رپورٹ نگاری مرکزی اہمیت کا حامل ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ الفاظ کی مناسب استعمال، واقعات کی غیر جانبدار تصویر کشی اور عوامی آگاہی رپورٹ نگاری کے اہم مقاصد ہوتے ہیں۔ اس اکائی میں رپورٹ نگاری پر

آسان اور سادہ انداز بیان اختیار کرتے ہوئے رپورٹ نگاری کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

محاورے تحریر کو مزیدار بناتے ہیں۔ محاوروں کی مرادف معنی کافی لطف دیتی ہے۔ اکثر محاورے اصطلاحی یا روزمرہ کی معنی سے مزیدار بنتے ہیں۔

مختصر الفاظ اور متاثر کن انداز میں اپنی بات کہنے میں محاورے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ محاوروں کے بغیر کوئی زبان متاثر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ محاورے راقم اور قاری کے درمیان خوشگوار تعلق قائم کرتے ہیں۔ محاورے زبان کی جان ہوتے ہیں۔ اکائی محاورے کے تعلق سے بھرپور تعارف پر مشتمل ہے۔

1.9 نمونہ امتحانی سوالات

(الف) درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

۱۔ ''رپورٹ نگاری صحافت کی جان ہوتی ہے۔'' ۔۔۔۔ وضاحت کیجیے۔

۲۔ رپورٹر کی خصوصیات بیان کیجیے۔

۳۔ کسی ایک محاورے کی معنی لکھیے اور مثال میں نثری جملہ اور شاعری درج کیجیے۔

(ب) مندرجہ ذیل سوالات کے طویل جوابات دیجیے۔

۱۔ اخبار میں شائع کسی اہم خبر کو مع تصویر پیش کیجیے۔

۲۔ محاورے پر تفصیلی مضمون قلم بند کیجیے۔

۳۔ رپورٹ نگاری پر سیر حاصل مضمون لکھیے۔

1.10 فرہنگ

نعمت غیر مترقبہ	۔	وہ اچھی چیز جو غیر متوقع طور پر ملے
لامحالہ	۔	ناچار
طشت از بام کرنا	۔	ظاہر کرنا، عیاں کرنا
غیر متعصب	۔	تعصب یا بے جا حمایت نہ کرنے والا
شکستہ	۔	خراب، ٹوٹا ہوا
راقم	۔	رقم کرنے والا، لکھنے والا
متعارف	۔	مشہور، معروف
منطقی	۔	ٹھیک سے سوچنے والا، بادلیل
استعجاب	۔	حیرانی، تعجب
اقتصادی	۔	مالی، معاشی
دلجمعی	۔	اطمینان، تسلی
تدابیر	۔	تدبیر کی جمع، تجویز، علاج، حکمت
مقصود	۔	ارادہ کیا گیا، مراد

1.11 سفارش کردہ کتابیں

رہبر اخبار نویسی	از	سید اقبال قادری
اردو ریڈیو اور ٹیلیویژن میں ترسیل وابلاغ کی زبان	از	کمال احمد صدیقی
عوامی ترسیل: اصول ونظریات	از	ڈاکٹر احمد خان

☆☆☆

اکائی: 2 ۔ محمد حسین آزاد، قرۃ العین حیدر، احتشام حسین

ساخت :

2.1 اغراض ومقاصد

2.2 تمہید

2.3 محمد حسین آزاد، قرۃ العین حیدر، احتشام حسین کا عہد

2.4 محمد حسین آزاد

2.4.1 محمد حسین آزاد کی حیات وشخصیت

2.4.2 محمد حسین آزاد کی ادبی خدمات

2.5 قرۃ العین حیدر

2.5.1 قرۃ العین حیدر کی حیات وشخصیت

2.5.2 قرۃ العین حیدر کی ادبی خدمات

2.6 احتشام حسین

2.6.1 احتشام حسین کی حیات وشخصیت

2.6.2 احتشام حسین کی ادبی خدمات

2.7 خلاصہ

2.8 نمونہ امتحانی سوالات

2.9 فرہنگ

2.10 معاون کتابیں

2.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس لائق ہوجائیں گے کہ:

- محمد حسین آزاد، قرۃ العین حیدر اور احتشام حسین کے دور کی خصوصیات کو سمجھ سکیں۔
- ان عوامل کو سمجھ سکیں جن کی عکاسی ان کی ادبی کاوشوں میں جا بجا نظر آئی۔
- محمد حسین آزاد کی حیات وشخصیت، فنی بصیرت اور ادبی خدمات پر گفتگو کر سکیں۔
- ان کے ادبی مقام کا محاکمہ کر سکیں۔
- قرۃ العین حیدر کی حیات، شخصیت، فنی خصوصیات اور ادبی تخلیقات کا جائزہ لے سکیں۔
- ان کے ادبی مقام کا تعین کر سکیں۔
- احتشام حسین کی حیات، شخصیت اور ادبی نظریات پر گفتگو کر سکیں۔
- ان سب سے متعلق اپنی آرا پیش کر سکیں۔

2.2 تمہید

محمد حسین آزاد، قرۃ العین حیدر اور احتشام حسین اردو ادب وتنقید میں ان معدودِ چند اربابِ ادب کی فہرست میں شامل ہیں کہ جنھوں نے نہ صرف زبان وادب میں تخلیقی اور تنقیدی کاوشیں انجام دیں بلکہ ادبی زاویوں کو نئی سمت عطا کی اور ایسے تصورات پیش کئے جن کی حیثیت ادب میں آفاقیت کی حامل ہے۔ محمد حسین آزاد کو شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔ وہ حالی، شبلی اور سرسید کے معاصرین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں مہدی افادی رقم طراز ہیں:

> سرسید سے اگر معقولات لے لیجئے تو کچھ نہیں رہتے، نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی کا بھی جہاں تک تعلق ہے، سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں لیکن آقائے اردو یعنی پروفیسر آزاد صرف انشاء پرداز ہیں جنھیں کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔

(بحوالہ تاریخِ ادب اردو، جمیل جالبی جلد چہارم، حصہ دوم، ص۔990)

جہاں تک قرۃ العین حیدر کا تعلق ہے انہیں بیسویں صدی کی سب سے اہم فکشن نگار سمجھا جاتا ہے۔ انہیں گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ انہوں نے ناول افسانہ اور ناولٹ تینوں افسانوی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کے ناول آگ

کا دریا کو عالمی شہرت حاصل ہوئی۔انہوں نے اردو فارسی ادب کے علاوہ مغربی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔تراجم کے شعبے میں بھی انہوں نے نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔

اردو ادب میں احتشام حسین مابعد آزادی ادب اور تنقید کے حوالے سے نہایت اہم مقام رکھتے ہیں۔ان پر مارکسزم کے زیرِ اثر ترقی پسند تحریک کا گہرا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔انہوں نے تاریخ وتنقید،شاعری اور سفرنامہ جیسی صنف میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔وہ ادب میں مادی حقائق کو مرکزیت دینے کے قائل ہیں۔اربابِ ادب نے انہیں سائنٹفک نظریے کا حامل قرار دیا ہے۔ان کے یہاں سماجیات اور تہذیبی رویہ نہایت متوازن انداز میں دیکھا جا سکتا ہے۔

2.3 محمد حسین آزاد،قرۃ العین حیدر اور احتشام حسین کا عہد

محمد حسین آزاد نے جس وقت آنکھ کھولی اس وقت ہندوستان پر انگریز حکومت کا کا دبدبہ تھا۔وہ بڑی حکمتِ عملی سے یہاں اپنے معاشرتی اور تہذیبی نظام کو نافذ کرنا چاہتی تھی اور اس مقصد میں اسے بڑی حد تک کامیابی حاصل کی تھی۔انہوں نے یہاں کی معاشرتی تہذیب کا بغور مطالعہ کیا یہاں کی مقامی زبانوں میں دسترس حاصل کی نیز اعلیٰ عہدیداروں کے ساتھ ساتھ عوام الناس سے روابط قائم کئے۔اس دور میں پنجاب میں ڈاکٹر لائٹز کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے بڑی شہرت تھی۔1864 میں لائٹز مقامی زبانوں میں انگریزی خیالات وتصورات پر مبنی تعلیمی مقاصد کو پیش کرنے بڑی تن دہی سے کوشش کر رہے تھے۔اسی اثنیٰ میں آزاد کی ملاقات لائٹز سے ہوگئی۔آزاد مغربی افکار وخیالات سے بڑی حد تک متاثر تھے۔اس طرح پنجاب میں ایک انجمن قائم ہوئی جس کے صدر ڈاکٹر لائٹز منتخب کئے گئے۔انجمنِ پنجاب اور آزاد کی ادبی کاوشوں کا تذکرہ اکائی کے آئندہ صفحات میں ہوگا۔یہاں صرف ان کے دور کی خصوصیات اور پس منظر کو پیش کرنا مقصد ہے جنہوں نے آزاد کی نظریہ سازی میں اہم کردار ادا کیا۔

جہاں تک قرۃ العین حیدر کے عہد کا تعلق ہے تو ان کا عہد مابعد آزادی سے ہی شروع ہوتا ہے۔واضح رہے کہ 1947 میں ہندوستان کی آزادی نے جہاں عالمی سطح پر خوشی عطا کی تھی مگر تقسیمِ ہند کے واقعے اور قیامِ پاکستان نے برّصغیر کے عوام کی مفسیات کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔عوام الناس میں ایسے افراد بھی تھے جو بہت خوش تھے مگر دوسری جانب ایک غم کی لہر دوڑ گئی تھی ہجرت کے مسائل اپنوں کا بچھڑنا،جدائی کا غم وغیرہ حقائق نے المناک صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔اس کے پہلو بہ پہلو گروداس پور سے جانے والی ریل کا فرقہ وارانہ نفرت کا سانحہ حساس عوام کے لئے کسی قیامت سے کم نہ تھا،گو یا قیامتِ صغریٰ برپا تھی۔جن تخلیق کاروں کی نفسیات پر ان واقعات کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ان میں قرۃ العین حیدر اور سعادت حسن منٹو کے نام قابلِ ذکر ہیں۔قرۃ العین حیدر ان واقعات کو آخر وقت تک نہ بھلا سکیں ناچیز

کی دو بار کسی سلسلے میں ان کے گھر پر ملاقات ہوئی تو جس طرح کے سوالات انہوں نے کئے تو ان سے یہی عندیہ ملتا ہے کہ تقسیمِ ہند کا سانحہ ان کے لئے نا قابل برداشت تھا۔ان کا ناول آگ کا دریا ہندوستان کی قدیم تہذیب کے ساتھ ساتھ غدر اور تقسیمِ ہند کے اہم واقعات کی نشاندہی کرتا ہے۔ان کے حالات اور کوائف کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی قدر و قیمت کا تذکرہ اس اکائی کے آئندہ صفحات میں ہوگا۔ یہاں صرف ان کے عہد کی خصوصیات کی نشاندہی مقصود ہے۔

احتشام حسین نے اردو ادب میں دورِ جدید کی تنقید و تحقیق اور تخلیق میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔گو ان کا عہد مابعد آزادی پر مشتمل ہے تاہم ان پر ترقی پسند تحریک جو مارکسی نقطہ نظر کے تحت وجود میں آئی تھی اس کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ان کی تحریریں اسی سائنٹفک زاویے کی غماز ہیں۔ مابعد آزادی سماجی عوامل اور مسائل کی عکاسی ان کی تحریروں میں معروضی انداز میں منعکس ہوتی ہیں۔انہوں نے زبان کا لسانی خاکہ جس انداز میں پیش کیا اس سے ان کی محققانہ بصیرت اور تاریخی شعور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ان کا عہد ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کے منجملہ عناصر کو پیش کرتا ہے مگر جہاں تک ان کی تحریروں میں زمانی اثرات کا تعلق ہے وہاں مارکسی زاویے کے تحت ادب برائے سماج اور ادب برائے زندگی کا نظریہ حاوی ہے۔اس دور میں ادب میں مادی حقائق کی عکاسی کو بہت زیادہ اہم تصور کیا گیا۔قرۃ العین حیدر کی شخصیت اور ان کی ادبی کاوشوں کا ذکر اس اکائی کے آئندہ صفحات میں ہوگا یہاں صرف ان کے عہد کے اہم پہلوؤں کی نشاندہی مقصود ہے۔

<u>اپنے مطالعے کی جانچ</u>

۱۔ انجمن پنجاب کے صدر کون تھے ؟

۲۔ ناول آگ کا دریا ہندوستان کے کن واقعات کی نشاندہی کرتا ہے؟

۳۔ احتشام حسین نے اردو ادب کے کس دور کی تنقید و تحقیق اور تخلیق میں کلیدی کردار ادا کیا ہے؟

محمد حسین آزاد

2.4.1۔ محمد حسین آزاد کی حیات اور شخصیت

محمد حسین آزاد کے والد کا نام محمد باقر تھا۔آزاد کا وطن دلی تھا۔آزاد کی ولادت 1832 میں ہوئی ان کی ابتدائی تعلیم اس وقت کے مشہور و معروف شاعر شیخ ابراہیم ذوق کی سرپرستی میں ہوئی۔غدر کے انقلاب سے آزاد کی زندگی بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ان کے والد محمد باقر کو انگریزوں نے شہید کر دیا۔آزاد کا سبھی کچھ برباد ہو گیا۔ابتدائی زندگی

کے ایام میں نہایت غربت کی زندگی بسر کی ۔ بعدازاں انہیں لاہور میں 15 روپیے ماہوار ملازمت مل گئی ۔ کچھ دنوں میں ہی انہوں نے اپنی لیاقت کا لوہا منوالیا۔ انگریز حکومت ان کی قابلیت کی گرویدہ ہوگئی ۔انہوں نے حکومت وقت کے کہنے پر قصصِ ہنداورمختلف ریڈروں کے لکھنے کا کام انجام دیا۔انہیں علمی خدمات کے لئے کابل اور بخارا بھیجا گیا۔انہیں یہ فخر حاصل ہے کہ انجمنِ پنجاب کے قیام میں انہوں نے اہم کردارادا کیا۔

وہ دومرتبہ ایران گئے ۔ چنانچہ 1965 اور 1883 میں انہوں نے زبانِ فارسی پر خاص توجہ آزاد نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کارلاتے ہوئے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔انہوں نے اردو میں جدید رنگ کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے ۔انہوں نے نہ صرف اردوشاعری بلکہ نثر میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے ۔1874 نظمِ جدید کے آغاز کا دور ہے 1875 میں انجمنِ پنجاب کے اخبار رہنمائے پنجاب کی ادارت کی ذمہ داری بھی آزاد کو دی گئی ۔

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ 1857 کے انقلاب میں توپ کے دھماکے سے ان کی شیرخوار بچی کا انتقال ہوگیا۔ بعدازاں 1877 میں ان کی پرانی ملازمہ ملازمہ لاہور کے گھر میں آگ لگنے سے ہلاک ہوگئی ۔علاوہ ازیں سفر ایران سے پیشتر ان کی جوان بیٹی امتہ السکینہ اللہ کو پیاری ہوگئی ۔ یہ بیٹی انہیں اپنے تمام بیٹوں سے زیادہ پیاری تھی ۔آزاد کے 14 بچے تھے جن میں صرف ایک آغا ابراہیم حیات رہے ۔انہوں نے تیرہ بچوں کی وفات کا صدمہ برداشت کیا ۔1882 میں وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے ۔ وہ اس حالت میں بھی تصنیف وتالیف کی خدمات انجام دیتے رہے ۔آخرکار 1910 میں انہوں نے اس دنیا کو الوداع کہہ دیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ انجمن پنجاب کے صدر کون تھے ؟

۲۔ ناول آگ کا دریا ہندوستان کے کن واقعات کی نشاندہی کرتا ہے؟

۳۔ احتشام حسین نے اردوادب کے کس دور کی تنقید وتحقیق اورتخلیق میں کلیدی کردارادا کیا ہے؟

محمد حسین آزاد کی ادبی خدمات

محمد حسین آزاد نے نثر اور نظم دونوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ۔ان کی متعدد تصانیف ہیں: فارسی ریڈریں جو دو حصوں پر مشتمل ہے ۔اردو ریڈریں جس کے تین حصے ہیں ۔ اردو کا قاعدہ وقواعدِ اردو، قصصِ ہند، سخندانِ فارس، آبِ حیات، نیرنگِ خیال، دربارِ اکبری، سیر ایران، دیوانِ ذوق، مکاتیبِ آزاد اور نظمِ آزاد قابلِ ذکر ہیں ۔ جدید اردو نظم کے

آغاز وارتقا میں انجمنِ پنجاب کی گراں قدر خدمات رہی ہیں۔ 19 اپریل 1874 کومحمد حسین آزاد نے ایک خطبہ دیا۔ یہ لکچر کترییونت کے بعد نظمِ آزاد میں شامل ہے۔ اس میں انہوں نے کرنل ہالرائڈ کے خیالات اور تصورات کو موضوعِ گفتگو بنایا جنہیں ان سے گفتگو کے دوران اخذ کرلیا تھا۔

آزاد کے خطبات نے نئی شاعری میں تمام مروجہ نظریات وتصورات کی نفی کی۔ اس سے پیشتر الطاف حسین حالی کی نظم برکھارت کو مشاعرے میں پیش کیا گیا تھا جو موضوعات شاعری میں ایک اہم پیش رفت تھی۔ انجمنِ پنجاب کے اسی میلان پر نظم کی بنیاد رکھی گئی۔ آزاد کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ زمانے کے ساتھ خود کو بدل سکتے تھے۔ انہوں نے دلی کالج کے تحت بدلتے ہوئے تصورات سے خود کو ہم آہنگ کرلیا تھا۔ جہاں تک آزاد کے اسلوب کا تعلق ہے تو انہوں نے ان کی تحریروں سے انشاء پردازی کا مذاق منعکس ہوتا ہے وہ اپنی تحریروں کو کئی مرتبہ کاٹ چھانٹ کر درست کرتے ہیں۔ محمود شیرانی ان کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

> ''فارسی میں ابوالفضل اور ظہوری کے مقلد پیدا ہوگئے مگر آزاد کا ابھی تک کوئی مقلد پیدا نہیں ہوا۔''

(بحوالہ تاریخِ ادب اردو، جلد چہارم، حصہ دوم، از جمیل جالبی، ص۔ 1044 تا 1045)

آزاد کے مضامین میں گلشنِ امید کی بہار سے چند اقتباسات پیش کیے جارہے ہیں جن سے آپ ان انشائیوں کی خصوصیات سمجھ سکیں گے۔ آزاد کا یہ اقتباس اس لیے قابلِ ذکر ہے کہ اس میں وہ امید سے وابستہ تمام خصوصیات نہایت لطیف پیرائے میں ذکر کرتے ہیں:

> خدا کی نعمتیں اور ساری خوش نصیبی کی دولتیں حاصل ہوجائیں پھر بھی یہ جادو نگار مصور ایک نہ ایک ایسی تصویر سامنے کھینچ دیتا ہے، جسے دیکھ کر یہی خیال آتا ہے کہ بس یہ بات ہو جائے گی تو ساری ہوسیں پوری ہو جائیں گی اور پھر سب آرزوؤں سے جی سیر ہوجائے گا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ امید کا ہونا ہر حالت میں ضرور ہے۔ وہ ضروری شے ہے کہ دنیا کی بہتر سے بہتر حالت میں بھی ہم کو اس ضرورت سے بے نیاز نہیں کر سکتی، کیونکہ حقیقت میں یہ مشغلے زندگی کے بہلاوے ہیں۔ اگر ان کا سہارا ہمارا دل نہ بڑھاتا رہے تو ایک دم گزارنا مشکل ہو جائے اور زندگی وبال معلوم ہونے لگے۔

ان کی نثر میں فطرت نگاری کی جھلک مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھی جا سکتی ہے:

> بلبلیں جو پیچھے بھر رہی تھیں وہ آگے اا گے اڑتی چلی جاتی تھیں۔ اگرچہ میں بہت پھرتی سے پہنچا تھا اور جو بہاریں تھیں وہ ہر قدم سامنے تھیں۔ میں اا گے بڑھتا تھا اور وہ بھی آگے بڑھتی جاتی تھیں۔

آزاد کے دلفریب اسلوب کی ایک اور جھلک مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھی جا سکتی ہے:

> میں نے اسے بھی چھوڑا اور ایک اور کو جا لیا۔ وہ گھبرایا ہوا جاتا تھا کہ چچا کی میراث پر قبضہ کرے۔ کیونکہ اس کی بیماری کی خبر سننے میں آئی تھی۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص دیکھا کہ بے تحاشا بھاگا چلا گیا تھا۔ اس نے غوطہ خوری کی کل ایجاد کی تھی اس کے دریائے منافع میں غوطہ مارا چاہتا تھا یعنی کچھ اور نہ ہو تو ایجاد کا نعام ہی ہاتھ آ جائے۔

آزاد کی نثر پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ قدیم طرزِ تحریر کی طرف مائل تھے تاہم انہوں نے جدید رنگ کو اپنے اندر سمونے کی بھرپور کوشش کی جس میں وہ کامیاب رہے اور یہی قدیم و جدید امتزاج ان کی شناخت بن گیا۔ اازاد کی زبان میں فارسی کی نزاکت اور شائستگی کی فراوانی ہے۔ یہ نثر شاعرانہ صفات کی حامل ہے۔ ان کی نثر کے بارے میں جمیل جالبی رقم طراز ہیں:

> ''آزاد اپنی نچر میں بہتے چشمے کی سی روانی پیدا کرنے کے لئے لفظوں کی ترتیب کو اس طرح جماتے ہیں کہ آمد کا سماں پیدا ہو جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ نثر بے ساختگی کے عالم میں لکھی گئی ہے ۔جس میں الفاظ نگینے کی طرح جڑے ہوئے روشنی دے رہے ہیں ۔اچھے شعر کی طرح آزاد کی نثر میں بھی کسی لفظ کو بدلنا ممکن نہیں ہوتا۔''

(بحوالہ تاریخِ ادب اردو، جلد چہارم از جمیل جالبی، ص۔ 1047)

مذکورہ مباحث کی روشنی میں یہ عندیہ ملتا ہے کی محمد حسین آزاد کی نثر اور ان کے پیش کردہ تمام نظریات آج بھی قارئین اور اربابِ ادب کو اسلوبیاتی اور نظریاتی افکار کو پیش کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ نثر اور نظم دونوں میں غیر معمولی صفات کے حامل ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ محمد حسین آزاد کی تصانیف کے نام لکھیے۔

۲۔ حکومت وقت کے کہنے پر محمد حسین آزاد نے کون سی کتابیں لکھنے کا کام انجام دیا؟

۳۔ محمد حسین آزاد کا انتقال کب ہوا؟

قرۃ العین حیدر

2.4.3 قرۃ العین حیدر کی حیات اور شخصیت

قرۃ العین حیدر کی ولادت 20 جنوری 1926 کو اتر پردیش کے ضلع علی گڑھ میں ہوئی۔ ان کے والد سجاد حیدر یلدرم اردو ادب کے معروف افسانہ نگار تھے۔ ان کا تعلق اعلیٰ طبقے کے زمیندار خاندان سے تھا جو عہدِ مغلیہ میں اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ ان کے نگڑ دادا سید حسن ترمذی نے وسط ایشیا سے ہندوستان کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کے خاندان کے تمام افراد تعلیم یافتہ تھے اور اس خاندان کی خواتین علمی صلاحیتوں کی مالک تھیں۔ سجاد حیدر یلدرم کی نانی سیدہ مریم نے قرآن شریف کا فارسی میں ترجمے کا کام انجام دیا تھا۔

قرۃ العین حیدر کی والدہ نذر سجاد کے مضامین بنت نذر الباقر کے نام سے تہذیبِ نسواں، پھول اور دیگر رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ ان کا پہلا ناول اختر النسا بیگم 1908 میں منظرِ عام پر آیا، اسے دارالاشاعت نے شائع کیا۔ اس وقت ان کی عمر 14 سال کی تھی۔ بعد ازاں 1912 میں ان کی شادی سجاد حیدر یلدرم کے ساتھ ہوگئی تو وہ نذر سجاد کے نام سے تخلیقی کام انجام دینے لگیں۔ وہ سیاسی اور سماجی میدانوں میں بھی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتی تھیں۔

قرۃ العین حیدر کی ابتدائی تعلیم دہرہ دون میں ہوئی۔ پھر ان کا داخلہ لکھنؤ کے ایزابیلا تھوبرن کالج میں ہوگیا جہاں سے انہوں نے بی اے کی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں 1947 میں لکھنؤ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں انہوں نے گورنمنٹ اسکول آف آرٹس اور ہیڈ میز اسکول آف آرٹس لندن سے بھی سند حاصل کی۔ قرۃ العین حیدر نے کم عمری سے ہی کہانی لکھنے کا کام شروع کر دیا تھا تاہم ان کی کہانیاں کئی سال بعد منظرِ عام پر آئیں مثال کے طور پر بی چوھیا کی کہانی، بچوں کے اخبار، پھول وغیرہ، 5 سال بعد لاہور سے شائع ہوئیں۔

11 اپریل 1943 کو ان کے والد سجاد حیدر یلدرم لکھنؤ میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ قرۃ العین حیدر کی تحریریں انگریزی سے بڑی حد تک متاثر رہی ہیں۔ تقسیمِ ہند کے بعد انہوں نے پاکستان کی سکونت اختیار کر لی۔ وہ وہاں

1950 میں وزارتِ اطلاعات کے شعبے میں ایک آفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتی رہیں ۔ بعد ازاں لندن میں پاکستان ہائی کمیشن میں پریس اٹیچی کے طور پر کام کرتی رہیں ۔انھوں نے دستاویزی فلموں کے علاوہ پاکستانی کواٹرلی کے لئے ایکٹنگ ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے کے علاوہ پاکستانی ایر لائنس میں بھی اپنی خدمات انجام دیں ۔اس دوران جب ان کا ناول آگ کا دریا منظرِ عام پر آیا تو پاکستان میں اس پر اس حد تک بحث ہوئی کہ چھٹی دہائی کے اوائل میں انہوں نے ہندوستان کی سکونت اختیار کر لی ۔1964 تا 1968 میں انہوں نے بمبئی میں کیریر ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں ۔1975 میں انگریزی ہفتہ وار السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا کی معاون مدیر کا کام انجام دیتی رہیں ۔ان کی سنٹرل فلم بورڈ سے بھی وابستگی رہی ۔1967 میں ان کی والدہ نذر سجاد ایک طویل علالت کے بعد اللہ کو پیاری ہوگئیں ۔1982 تا 1984 قرۃ العین حیدر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ویزیٹنگ پروفیسر کے عہدے پر فائز رہیں ۔ جہاں تک ان کی شخصیت اوراس سے متعلق ان کا نظریہ ہے تو اس سلسلے میں وہ خود رقم طراز ہیں :

> ''ہمارا جو معاشرہ ہے ،جس طرح ہمارے ذہنوں کی تشکیل کی جاتی ہے اور جو ہمارے یہاں موجودہ حالات ہیں ان کی وجہ سے یا تو لوگ یا تو احساسِ برتری کی شکار ہیں اور یا احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں ۔ ہر فرد کسی نہ کسی طرح کے compex میں گھرا ہوا ہے normal کوئی بھی نہیں رہنا چاہتا اور میں ان لوگون کو بہت قابلِ قدر سمجھتی ہوں جو ہر ماحول اور ہر موقع پر نارمل رہتے ہیں ۔''

(بحوالہ مضمون میں خود ہی قصہ گو،از قرۃ العین حیدر،) (کتاب قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ،مرتبہ،ڈاکٹر ارتضیٰ کریم،ص۔25)

اس طرح قرۃ العین حیدر کے یہاں جہاں انانیت کا رویہ پایا جاتا ہے۔ان کے یہاں اعتدال بھی بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ان کی وفات 12 ؍اگست 2007ء کو نوئیڈا میں ہوئی اور تدفین جامعہ ملیہ کے قبرستان میں ہوئی ۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ قرۃ العین حیدر کی ولادت کب اور کہاں ہوئی ؟

۲۔ قرۃ العین حیدر کی تحریریں کس زبان سے متاثر رہی ہیں؟

۳۔ 1982 تا 1984 قرۃ العین حیدر شعبہ اردو،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کس عہدے پر فائز رہیں؟

2.4.4 قرۃ العین حیدر کی ادبی خدمات

قرۃ العین حیدر بیسویں صدی کی ایک اہم فکشن نگار ہیں جنہیں 1984ء میں پدم شری ایوارڈ اور 1990ء میں گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوزا گیا۔ان کی تخلیقات میں ہندوستانی تہذیب کی جھلک کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب وتمدن اور انگریزی الفاظ کی فراوانی دیکھی جاسکتی ہے۔بعض اوقات فرانسیسی الفاظ کا استعمال بھی انہوں نے کیا ہے۔ان کی متعدد تصانیف ہیں۔انہوں نے تراجم اور صحافت کے میدانوں میں بھی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔انہیں 1969 میں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ افسانوی مجموعے :

1۔ ستاروں سے آگے (1947)

2۔ شیشے کے گھر، مکتبہ جدید، لاہور 1954

3۔ پت جھڑ کی آواز، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، 1967

4۔ روشنی کی رفتار، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ 1982

5۔ جگنوؤں کی دنیا، انجمن ترقی اردو ہند، 1990

۲۔ ناول:

1۔ میرے بھی صنم خانے، 1949

2۔ سفینۂ غمِ دل، 1952

3۔ آگ کا دریا، 1959

4۔ آخرِ سفر کے ہم سفر، 1971

5۔ کارِ جہاں دراز ہے، دو جلدوں پر مشتمل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، لاہور 1990

6۔ گردشِ رنگِ چمن تک، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، 1988

7۔ چاندنی بیگم، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، 1989

۳ ۔ ناولٹ : (چارناولٹ 1989ء)

1۔ دلربا

2۔ سیتاہرن

3۔ چائے کے باغ

4۔ اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس علی گڑھ

۴۔ رپورتاژ :

1۔ ستمبر کا چاند، درچمن ہر ورتی دفتر وحال وگزشت،نقوش،لاہور

2۔ کوہ دماند، آج کل نئی دہلی

3۔ گل گشت، گفتگو، بمبئی،

4۔ خضر سوچتا ہے، یک بابی تمثیل، جہانِ دیگر، (آج کل،اردو)

۵۔ تراجم :

1۔ ہمیں چراغ ہمیں پروانے	از ہنری جیمس
2۔ آلپس کے گیت	از واسل وائی کوف
3۔ ماں کی کھیتی	از چنگیز اعتمادوف
4۔ آدمی کا مقدر	از میخائل شولوخوف
5۔ کلیسا میں قتل	از ٹی ایس ایلیٹ
6۔ تلاش	ٹرومین کا یوٹ
7۔ یووکیہ	

انہوں نے بچوں کے ادب کی بھی تخلیق کی اورتراجمے بھی کیے :

1۔ بہادر بچے　　2 ۔ لومڑی کے بچے　　3۔ میاں ڈھینچوں کے بچے

4۔ حسن عبدالرحمٰن　　5۔ بھیڑیے کے بچے

ان میں طبع زاد تخلیقات بھی قابلِ ذکر ہیں:

1۔ شیر خاں 2۔ ہرن کے بچے

اس طرح قرۃ العین حیدر کی ادبی کاوشوں کی ایک طویل فہرست ہے جو مختلف اصناف کی شکل میں دیکھی جا سکتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کے فن کا جہاں تک تعلق ہے تو ان کے یہاں اقوام کا تہذیبی وجود اور ان کی اقدار تاریخ میں ہے ۔وہ اس کے وجود کو ماضی میں تلاش کرتی ہیں ۔ان کے ناولوں میں ماضی اور حال دونوں کا امتزاج پایا جاتا ہے۔وہاں وقت ایک اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔آگ کا دریا، آخری شب کے ہم سفر اور گردشِ رنگِ چمن میں یہ خصوصیات دیکھی جا سکتی ہیں۔مزید برآں ان کے ناول اور کہانیوں میں انسانی وجود کی اندرونی بے قراری اور تنہائی کا احساس نمایاں ہوتا ہے۔نیز آشوب ذہنی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔یہ کیفیات ورجینیا وولف کی یاد دلاتی ہیں مگر مصنفہ اس امر کو تسلیم کرنے سے گریز کرتی تھیں۔ان کے فن میں ان کا گہرا مطالعہ اور ان کی برسوں کی محنت اور ریاضت جھلکتی ہے۔انہوں نے دنیا کے بڑے تخلیق کار فلسفیوں اور قدیم دستاویزوں کا بڑی دلجمعی سے مطالعہ کیا ہے۔انہوں نے ایک ایسی مشترکہ تہذیب کی عکاسی اپنی تخلیقات میں کی ہے کہ جن سے ہندوستانی تہذیبی افکار و خیالات ایک نامیاتی شکل میں ابھرتے ہیں۔انہوں نے داخلی زندگی کی پیش کش میں شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔اس کے برتنے میں انہیں کمال حاصل رہا ہے۔اس تکنیک کے ذریعے انسان کی باطنی کیفیات کو پیش کیا جاتا ہے۔اس کے ذریعے تخلیق کار کردار کے ذہن میں داخل ہو جاتا ہے اور اس کے جذبات و احساسات کو پیش کرتا ہے۔اس کے ذریعے ناول نگار ماضی حال اور مستقبل پر اپنی گرفت کو قائم رکھ سکتا ہے مگر ان میں ربط قائم رکھنا ضروری ہے۔اس کی ایک مثال حسبِ ذیل ہے۔

> کہاں جاتی ہو؟ چمپا نے گھبرا کر پوچھا۔۔۔۔کہیں نہیں۔ہم سب یہیں موجود ہیں ۔ہم اور تم الگ الگ کہاں ہیں۔بلکہ اب تم بھی چلی جاؤ۔تمہارے اس وقت کے ساتھی تم کو جلاتے ہیں۔ (آگ کا دریا)

اربابِ ادب کے مطابق ان کا کوئی بھی ناول مکمل طور پر شعور کی رو کا حامل نہیں ہے بلکہ ان میں مختلف طریقوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ان کے افسانے کی مثال مندرجہ ذیل ہے:

> یہاں سے بہت دور خطرناک طوفان سے گھرے ہوئے یورپی سمندر میں ہرے بھرے جزیروں کا ایک جھنڈ جو فلپائن کہلاتا ہے۔اس کے جاگتے جگمگاتے

دارالسلطنت کے ایک بے رنگ سے محلیکی شکستہ عمارت کے ایک بے حد چپٹی ناک اور فرشتے کے سے معصوم دل والی فلپنولڑکی رہتی ہے جو اپنے بچے کے لئے کھلونے جمع کررہی ہے اوراپنے خدا کی واپسی کی منتظر ہے جس کی ذات پراسے کامل یقین ہے۔

(بحوالہ افسانہ کارمن ازقرۃالعین حیدر)

ایک اوراقتباس ملاحظہ ہو:

اس وقت مجھے خیال آیا کہ میں ہر طبقے کے ہر قسم کے طبقے کو اپنی افتادطبع کے ذریعے کم ازکم اپنی حدتک ذہنی طور پرہموار کرتی چلی جاتی ہوں مگر ہوزے اوراس کے والدین اس ملک کے دس دولت مندترین خاندانوں میں شامل تھے اور یہاں کے حکمراں طبقے کے اہم ستون تھے اوران لوگوں کوسمجھانا بالکل بے کارتھا کہ مجھے وائی ڈبلیوکیواں اتنااچھالگاہے اورمیں اس کے وہاں ٹھرنے پر کیوں اتنی مصرہوں۔

(بحوالہ افسانہ کارمن ازقرۃالعین حیدر)

اس طرح قرۃالعین حیدرکی زبان سے ان کی خوبیوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اس کے علاوہ ان کے فن میں نسائی حسیت کونظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ان کے یہاں جدید دورکی عورت کی مختلف شکلیں ہیں مگر ہندوستانی عورت کی متعدد خوبیاں انہوں نے بڑی چابک دستی سے پیش کی ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ قرۃالعین حیدرکوکس سن میں پدم شری اور گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا؟

۲۔ قرۃالعین حیدر کے افسانوی مجموعوں کی تعداد بتایئے۔

۳۔ قرۃالعین حیدر کے کوئی دوناولٹ کے نام لکھیے۔

پروفیسر احتشام حسین

2.5.1 احتشام حسین کی حیات وشخصیت

سید احتشام حسین ایک روایت پسند خاندان میں پیدا ہوئے۔احتشام حسین کے مطابق ان کی تاریخِ پیدائش 11 جولائی 1912 ہے۔لیکن وہ اپنی تاریخ پیدائش سے متعلق رقم طراز ہیں:

''میری پیدائش واقعی تو 21 اپریل 1912 ہے مگر سرکاری کاغذات میں 11 جولائی 1912 ہے۔''

(بحوالہ نقشِ کوکن، احتشام حسین نمبر)

احتشام حسین کا خاندان اپنی جاگیرداری پر فخر کرتا تھا۔ان کی ابتدائی تعلیم ماہل میں ہوئی۔ابتدائی دس سال وہ اپنی پھوپی کے یہاں رہے کیونکہ ان کے کوئی بیٹا نہیں تھا۔احتشام حسین کی ایک چچی انہیں راجہ میا کہتی تھیں۔اس کے بعد یہ نام رجن میں تبدیل ہوگیا اور اس طرح عرفِ عام میں انہیں رجن کہتے تھے۔تین سال کی عمر میں ان کے پھوپھا انہیں اپنے ساتھ لے گئے تھے وہاں وہ دس سال تک رہے۔ان کی ابتدائی تعلیم گورکھپور اور بنارس میں بھی ہوئی کیونکہ ان کے پھوپھا پولیس میں ہیڈ کانسٹبل تھے۔انہوں نے دینیات قرآن شریف اور اردو فارسی کے ساتھ ساتھ ریاضی کی تعلیم بھی حاصل کی تھی احتشام حسین اپنے پھوپھا اور پھوپھی سے کتنی محبت کرتے تھے اس کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

بچپن میں میں پھوپھی اور پھوپھا کے ساتھ رہا اور ان ہی کو ماں باپ سمجھتا رہا۔اب بھی نہ مجھے اس بات کا اندازہ ہے کہ وہ لوگ مجھ نہ مجھے اس بات کا اندازہ ہے کہ وہ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔

(بحوالہ ساحل اور سمندر، ص۔31)

احتشام حسین کی پرورش مذہبی ماحول میں ہوئی جہاں مجلسیں اور عزہ داری کا اہتمام ہوتا تھا۔انکے خاندان اور گردونواہ میں شاعری سے دلچسپی کا ماحول عام تھا اور سیاسی معاشرتی اور علمی موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی۔سید احتشام حسین اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے اس لئے انہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا۔ان کی زندگی میں کچھ واقعات ایسے پیش آئے کہ ان کا سکون ختم ہوگیا۔یہ ایام ان کی زندگی کے پریشان کن رہے تھے۔بہر حال انہوں

نے 1932 میں سیکنڈ ڈویژن انٹرمیڈیٹ مکا امتحان پاس کرلیا تھا۔ یہ دوران کے ذہنی ارتقا کے ابواب کو روشن کرتا ہے انہوں نے رسائل میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ بقول خود احتشام حسین :

> 1930 میں شاعر اور مضمون نگار بن چکا تھا۔نہیں معلوم کن رسائل اور مضامین نے دل ودماغ کو ترتیب دیا۔

(بحوالہ ایک پرخلوص روح، سید احتشام حسین، زمانہ،فروری مارچ 1943،ص۔30)

انٹرمیڈییٹ کرنے کے بعد احتشام حسین نے الہٰ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔اس میں انہوں نے انگریزی ادب تاریخ اور اردو جیسے مضامین کا انتخاب کیا۔اس زمانے میں احتشام حسین جن اساتذہ سے بہت زیادہ متاثر ہوئے ان میں ستیش چندر دیپ اور اعجاز حسین تھے۔ان کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں اعجاز حسین کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ان پر اعجاز حسین کے یہاں منعقد ہونے والی ادبی محفلوں بہت گہرا اثر ہوا۔ایم اے کے پہلے سال میں انہوں نے آئی سی ایس اور پی سی ایس کا امتحان بھی دیا۔آئی سی ایس میں انہیں دوسرا اور پی سی ایس میں چوتھا نمبر حاصل ہوا۔انہوں نے ایم اے اردو میں فرسٹ ڈویژن کامیابی حاصل کی ۔انہیں یونیورسٹی کی جانب سے ایمپریس کوئن وکٹوریہ گولڈن جوبلی میڈل عطا کیا گیا۔ بعد ازاں ایل ایل بی میں بھی داخلہ لیا لیکن مکمل نہیں کر پائے۔18 جولائی 1938 کو لکھنو یونیورسٹی میں شعبہ اردو فارسی میں بحیثیت لکچرران کا تقرر ہو گیا۔دورانِ تعلیم اعجاز حسین کے ساتھ ان کی اس وقت ابھرتی ہوئے ترقی پسند تحریک کی انجمن میں وہ پہلے ہی شامل ہو گئے تھے۔

لکھنو یونیورسٹی میں تقرر ہونے کے بعد ان کی زندگی بہت پرسکون گزری۔ان کی شادی 1940 میں نگرام ضلع لکھنو کے میر فدا حسین صاحب وکیل کی پوتی ،سید حسن عسکری صاحب کی چھوٹی صاحبزادی ہاشمی بیگم سے ہوئی۔وہ نہایت خوش اخلاق اور مخلص اپنے شوہر کا خیال رکھنے والی تھیں۔احتشام حسین بھی ان سے بہت محبت کرتے تھے۔1960 میں احتشام حسین کا تقرر الہٰ آباد یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ہو گیا۔وہاں وہ پروفیسر اور ڈین جیسے عہدوں پر فائز رہے۔انہوں نے اپنے زمانے میں شعبے کو بلندیوں تک پہنچایا اور اساتذہ کا شاگردوں کے تئیں شفیق اور مخلصانہ روایت کو مستحکم کیا۔مگر وہ الہٰ آباد یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے حالات سے پریشان رہتے تھے۔1969 میں غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں روس کا سفر کیا۔وہاں سے آنے کے بعد وہ جن حالات سے پریشان تھے اسکا تذکرہ انہوں نے اپنی ڈائری میں کیا ہے ۔یکم دسمبر 1972 کو انہوں نے اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ کس سن سے احتشام حسین نے رسائل میں لکھنا شروع کر دیا تھا؟

۲۔ الٰہ آباد یونیورسٹی میں احتشام حسین کن اساتذہ سے بہت زیادہ متاثر ہوئے؟

۳۔ احتشام حسین کا انتقال کب ہوا؟

2.5.2 احتشام حسین کی ادبی خدمات

احتشام حسین کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔ ان کی شاعری کا دور 1926 سے شروع ہوتا ہے۔ گھر میں منعقد ہونے والی شعری نشستوں کے بموجب ان کے مزاج میں غزل کے تئیں پسندیدگی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے خود تحریر کیا ہے:

جہاں تک یاد ہے شعر کہنا 1928 میں شروع کیا تھا، اس وقت اعظم گڑھ میں تھا اور آٹھویں درجے کا طالب علم تھا، لیکن شعر کہنے کی رفتار ہمیشہ بے حد سست رہی۔

(بحوالہ احتشام حسین کا خط قاسم صدیقی کے نام 30 مارچ 1924 ،فروغِ اردو احتشام نمبر،ص۔548)

شاعری کے ساتھ انہوں نے نثر لکھنے کی شروعات 1928 میں کی تھی۔ اپنی مضمون نگاری کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

مضمون نگاری کا شوق غالباً 1929 میں ہوا۔ اس وقت کچھ افسانے لکھے جن میں زبان کے لحاظ سے نیاز فتحپوری کا تتبع تھا اور پلاٹ میں عمومیت تھی۔

(احتشام حسین میرا پسندیدہ افسانہ، مرتبہ بشیر ہندی، ص۔18)

یونیورسٹی کی ادبی فضا میں انہوں اعجاز حسین، فراق گورکھپوری اور پروفیسر دیپ نے ان کے ادبی ذوق کی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے علمی اور سیاسی مضامین لکھنا شروع کر دیئے۔ اسی دران 1935 میں سجاد ظہیر سے ملاقات ہوئی جن سے وہ بہت ہی متاثر ہوئے۔ اس طرح انہوں نے سماجی اور مذہبی مسائل پر مقالات لکھے۔ ابتدا میں نیاز فتح پوری کے اسلوب سے متاثر رہے بعد میں انہوں نے خود اپنی راہ کا انتخاب کر لیا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد احتشام حسن اشتراکیت سے متاثر ہو گئے۔ انہوں نے اشتراکی نظریات کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور ان ہی نظریات کی روشنی میں ادب کا مطالعہ کیا۔ وہ ان ہی نظریات کی روشنی میں ادبی مضامین لکھنے لگے۔ ان کے مضامین ملک گیر سطح پر شائع

ہوتے رہے۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 1942 کوشائع ہوا۔

احتشام حسین کا پہلا مجموعہ تنقیدی جائزے 1944 حیدرآباد حفیظ اکیڈمی سے شائع ہوا۔احتشام حسین انگریزی ہندی اور ب اردو تینوں زبانوں میں لکھتے تھے۔احتشام حسین کی مندرجہ ذیل تصانیف ہیں:

1۔ اردو تنقید کی تاریخ

2۔ ہندوستانی زبان کا خاکہ

3۔ تنقیدی جائزے

4۔ تنقیدی نظریات

5۔ افکار و مسائل

6۔ عکس اور آئینے

7۔ روشنی کے دریچے

8۔ ذوقِ ادب اور شعور

9۔ اعتبارِ نظر

10۔ ویرانے (افسانوی مجموعہ)

11۔ تنقید اور عملی تنقید

12۔ ادب اور سماج

13۔ ساحل اور سمندر (سفرنامہ)

احتشام حسین اشتراکی نقطہ نظر کے تحت مادی نظریات کو پیش کرتے ہیں۔لکھتے ہیں:

> سائنٹفک نقطہ نظر وہ ہے جو ادب کو زندگی کے معاشی، معاشرتی اور طبقاتی روابط کے ساتھ متحرک اور تغیر پذیر دیکھتا ہے۔یہ ایک ہمہ گیر نقطہ نظر ہے اور ادبی مطالعے کے کسی اہم پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔

(بحوالہ تنقیدی نظریات، احتشام حسین ص۔145)

جہاں تک احتشام حسین کے اسلوب کا تعلق ہے تو ان کا اسلوب نہایت سائیٹفک اور معروضیت کا حامل ہے یعنی ربط و تسلسل

کے ساتھ ساتھ برجستگی کی خوبی دیکھی جا سکتی ہے نیز تازگی اور قطعیت ان کے یہاں پائی جاتی ہے۔اسلوب سے متعلق وہ رقمطراز ہیں:

> نثر کی خصوصیات اظہارِ خیال کی برجستگی، روانی، ادبی لطافت اور استدلالی انداز میں رونما ہوتی ہیں۔انہیں پر قدرت حاصل کر کے ادیب صاحبِ اسلوب بنتا ہے۔
>
> (بحوالہ عکس اور آئینے، سید احتشام حسین، ص۔93)

احتشام حسین کے اسلوب کی خصوصیت سفر نامہ ساحل اور سمندر کے مندرجہ ذیل اقتباس میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے:

> امن دوستوں کو وہ سب کچھ کرنا چاہئے جس کے بعد جنگ جوئی کی خواہش کا دھبہ سرمایہ دار ملکوں کے دامن سے دھویا نہ جا سکے یا پھر وہ امن کی فضا قائم رکھنے پر مجبور ہو جائیں۔یقینی طور پر انسان اجتماعی طور پر چاہیں تو امن قائم ہو سکتا ہے اور دنیا جنت بن سکتی ہے۔

مزید برآں ان کے تاریخی زاویہ نگاہ اور مخطوطات سے متعلق معلومات کے تعلق سے سفر نامہ یہ لندن ہے کا مندرجہ ذیل اقتباس نہایت اہمیت کا حامل ہے:

> بیس ہزار مشرقی مخطوطوں کے علاوہ اصل ہندوستانی اور ایرانی تصاویر ڈیڑھ ہزار کی تعداد میں ہیں۔مخطوطوں میں سب سے بڑی تعداد سنسکرت کی ہے، آٹھ ہزار تین سو، اس کے بعد فارسی چار ہزار آٹھ سو، عربی، تین ہزار دو سو ستر اور ہندی ایک سو آٹھ۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے دوران ان کی خط و کتابت، ضروری کاغذات، نجی روز نامچے نہ جانے کتنے ہیں۔

اسی طرح انہیں لندن میں جس طرح برٹش میوزیم میں انہوں نے معلومات کا ذخیرہ دیکھا تو ان پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی ۔مثلاً یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> یہ سوچ کر واپس آیا کہ اس میوزیم کے متعلق کچھ پڑھ لوں گا، اس کے نقشے کو کچھ سمجھ لوں گا تو پھر آؤں گا۔سب کچھ دیکھنا تو محال ہے۔مجھے گھبراہٹ کیسی ہے ؟ کمتری کا احساس کیوں ہے؟ پسپائی سی کیوں محسوس کر رہا ہوں؟ علم کم ہے تو کیا

،اس کی پیاس تو بہت ہے۔ پھر آؤں گا۔

سید احتشام حسین نے مغل مصوری اور راجپوت مصوری سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

> دیکھا ہے کہ تقسیم کے بعد یہ خزانہ ہندوستان کو ملتا ہے یا پاکستان کو۔ شاید پاکستان دارا شکوہ سے دلچسپی نہ لے۔! مطبوعہ اردو کتابوں کا بھیڑ اذخیرہ ہے۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ کئی دن یہاں آؤں گا اور جو کچھ دیکھ سکوں گا دیکھوں گا۔ لائبریری سے نکل کر دوپہر کا کھانا سب کے ساتھ انڈیا کلب میں کھایا۔

الغرض احتشام حسین جس زاویہ نگاہ کو پیش کرتے ہیں اس میں جہاں ادب برائے زندگی کی عکاسی ہوتی ہے وہاں ان کی علم ادب کے حوالے سے غیر معمولی ذہانت کا عندیہ ملتا ہے۔ ان کا شمار اردو ادب کے ان معماروں میں ہوتا ہے جنہوں نے ادب کی ہر صنف کو نئی سمت عطا کی۔

<u>اپنے مطالعے کی جانچ</u>

ا۔ احتشام حسین کا پہلا مجموعہ کون سا ہے؟

۲۔ احتشام حسین کی ادبی زندگی کا آغاز کس صنف سے ہوا؟

۳۔ احتشام حسین کے افسانوی مجموعے کا کیا نام ہے؟

2.6 خلاصہ

محمد حسین آزاد ایک انشاء پرداز، محقق اور نقاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح جہاں تک قرۃ العین حیدر کا تعلق ہے انہیں بیسویں صدی کی سب سے اہم فکشن نگار سمجھا جاتا ہے۔ انہیں گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ انہوں نے ناول افسانہ اور ناولٹ تینوں افسانوی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کے ناول آگ کا دریا کو عالمی شہرت حاصل ہوئی۔ انہوں نے اردو فارسی ادب کے علاوہ مغربی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ تراجم کے شعبے میں بھی انہوں نے نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔

احتشام حسین نے اردو ادب میں دورِ جدید کی تنقید و تحقیق اور تخلیق میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ گوان کا عہد مابعد

آزادی پر مشتمل ہے تاہم ان پر ترقی پسند تحریک جو مارکسی نقطہ نظر کے تحت وجود میں آئی تھی اس کا گہرا اثر نظر آتا ہے ۔انہوں نے زبان کا لسانی خاکہ جس انداز میں پیش کیا اس سے ان کی محققانہ بصیرت اور تاریخی شعور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ان کا عہد ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کے مخملہ عناصر کو پیش کرتا ہے مگر جہاں تک ان کی تحریروں میں زمانی اثرات کا تعلق ہے وہاں مارکسی زاویے کے تحت ادب برائے سماج اور ادب برائے زندگی کا نظریہ حاوی ہے۔

2.7 نمونہ امتحانی سوالات

(الف) مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

۱۔ محمد حسین آزاد کی نثر کی کوئی مثال لکھئے اور اس کی وضاحت کیجئے۔

۳۔ قرۃ العین حیدر کی فکشن نگاری پر اپنی معلومات کا اظہار کیجئے۔

۳۔ احتشام حسین کے نظریے کی وضاحت کیجئے

۴۔ احتشام حسین کے لندن سفر میں برٹش میوزیم کے حوالے سے چند نکات لکھئے۔

(ب) مندرجہ ذیل سوالات کے تفصیلی جوابات لکھیے۔

۱۔ محمد حسین آزاد، قرۃ العین حیدر اور احتشام حسین کی ادبی حیثیت پر ایک نوٹ لکھئے۔

۲۔ احتشام حسین کی نثری خدمات پر ایک نوٹ لکھئے۔

۳۔ احتشام حسین کی حیات پر اپنی معلومات کا اظہار کیجئے۔

2.8 فرہنگ

انشاء پرداز	مضمون نگار
محقق	تحقیق کرنے والا
شعور کی رو	سمجھ یا فہم کا ایک بہاؤ (یہ فن میں برتی جاتی ہے)
مخطوطہ	ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی تحریر
کتر بیونت	کاٹ چھانٹ

مادی	طبعی، اصلی
سفرنامہ	سفر کے حالات پر کتاب
رپورتاژ	کسی واقعے کو دلچسپ افسانوی انداز میں لکھنا
ریاضی	علمِ ہندسہ یا حساب

2.8 معاون کتابیں

1۔ تاریخِ ادب اردو از جمیل جالبی

2۔ مختصر تاریخِ ادب اردو از اعجاز حسین

3۔ تاریخِ ادب اردو از رام بابو سکسینہ

4۔ اردو ادب کی تحریکیں از انور سعید

5۔ قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ از ارتضیٰ کریم

6۔ عکس اور آئینے از سید احتشام حسین

7۔ آگ کا دریا از قرۃ العین حیدر

8۔ تنقیدی نظریات از احتشام حسین

9۔ ساحل اور سمندر از سید احتشام حسین

10۔ تاریخِ ادب اردو از نور الحسن نقوی

☆☆☆

اکائی۔3 : یوسف ناظم، مشتاق احمد یوسفی، پروفیسر نورالعین علی

ساخت :

3.1 اغراض ومقاصد

3.2 تمہید

3.3 یوسف ناظم

3.3.1 یوسف ناظم کی حیات

3.3.2 یوسف ناظم کی ادبی خدمات

3.4 مشتاق احمد یوسفی

3.4.1 مشتاق احمد یوسفی کی حیات

3.4.2 مشتاق احمد یوسفی کی ادبی خدمات

3.5 پروفیسر نورالعین علی

3.5.1 پروفیسر نورالعین علی کی حیات

3.5.2 پروفیسر نورالعین علی کی ادبی خدمات

3.6 خلاصہ

3.7 نمونۂ امتحانی سوالات

3.8 فرہنگ

3.9 معاون کتابیں

3.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں تین مشہور ہستیوں کا تعارف، حیات وشخصیت اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے جس کا مقصد طلبا کو :

ا۔ ان ہستیوں سے قلمی ملاقات کرانا ہے۔

۲۔ ان کی حیات اور شخصیت کے روشن پہلوؤں سے میعارف کرانا ہے۔

۳۔ اردو ادب میں ان تینوں ہستیوں کی ادبی خدمات کا اعتراف کرانا ہے۔

3.2 تمہید

اردو ادب کے وسیع دامن میں کئی ایسی عظیم شخصیات کے نام ملتے ہیں جو مدت گزر جانے کے بعد بھی اردو ادب کی مختلف اصناف میں اپنی آب وتاب سے قارئین کے ذہنوں کو روشن کیے ہوئے ہیں۔ادب کی کسی بھی صنف کا مطالعہ کر لیجیے، ان کی روشنی قاری کو وسیع القلبی اور وسیع الذہنی عطا کرتی ہے۔ان ہستیوں میں اردو طنز ومزاح کے مشہور نام یوسف ناظم اور مشتاق احمد یوسفی اور اپنے ڈراموں سے معاشرے کی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کرنے والی پروفیسر نورالعین علی ہیں۔اس اکائی میں ان تینوں شخصیات کی حیات وشخصیت اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالی جائے گی۔

3.3 یوسف ناظم

3.3.1 یوسف ناظم کی حیات

مشہور طنز ومزاح نگار یوسف ناظم کا نام سید محمد یوسف تھا اور تخلص ناظم۔اس لحاظ سے وہ اپنے قلمی نام 'یوسف ناظم' سے اردو ادب کی غیر افسانوی صنف طنز ومزاح میں مقبول ومشہور ہوئے۔سرکاری ریکارڈ کے مطابق ان کا سن پیدائش 1918ء ہے لیکن ان کی ولادت دراصل 7 رنومبر 1921ء کو ریاست مہاراشٹر کے ایک تعلقہ جالنہ میں ہوئی۔یوسف ناظم نے جالنہ ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔دوران تعلیم انھیں کھیل کود سے بھی بہت دلچسپی رہی۔میٹرک تک وہ فٹ بال، ہاکی اور بیڈمنٹن کے ماہر کھلاڑی رہے۔یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ ان کھیلوں کے تقریباً چمپیئن رہے۔صوبائی ٹورنامنٹ میں دیگر اضلاعی ٹیموں کے ساتھ یوسف ناظم کی تعلقہ جالنہ کی ٹیم نے صوبائی ٹورنامنٹ جیت لی۔یوسف ناظم ادبی کے علاوہ دینی کتابوں کا مطالعہ بھی ذوق وشوق سے کرتے تھے۔انھیں راشدالخیری کی تحریریں بہت پسند تھیں۔اور

دوسری طرف وہ حجاب امتیاز علی کے بھی پرستار تھے۔

انھوں نے اورنگ آباد کالج سے انٹرمیڈیٹ امتحان پاس کرنے کے بعد 1944ء میں جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد سے ایم۔اے کی سند حاصل کی۔ جامعہ عثمانیہ میں ایم۔اے کے امتحان کے ساتھ ایک مقالہ لکھنا بھی شامل تھا۔انھوں نے ظریفانہ ادب پر اپنا ایم۔اے کا مقالہ مکمل کیا۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں یوسف ناظم کو ریڈیو اسٹار بننے کا موقع ملا۔ والد کی خواہش انہیں وکیل بنانے کی تھی لیکن اردو میں ایم۔اے کرنا یوسف ناظم کی ضد تھی۔ اردو میں ایم۔اے کی سند حاصل کرنے کی ضد نے انھیں اپنے وطن جالنہ کا پہلا ایم۔اے پاس فرد بنا دیا۔

ایم۔اے میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد حیدرآبا میں 1944ء ہی میں وہ محکمۂ لیبر میں مترجم کی حیثیت سے سرکاری ملازم ہوئے۔ تھوڑے ہی عرصے میں انھوں نے اسی ہی شعبہ میں منتظم اور پھر لیبر آفیسر کے عہدے پر ترقی پائی۔ ان پر انگریزی کے لیبر قوانین کو اردو میں منتقل کرنے کی ذمہ داری عائد تھی۔ 1960ء میں ریاستوں کی تقسیم کے بعد بحیثیت اسسٹنٹ کمشنر آف لیبر، وہ ممبئی منتقل ہوئے اور 1976ء میں اسی عہدے سے وظیفے پر سبکدوش ہوئے۔

یوسف ناظم ۔۔۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے چار سال ممبر سکریٹری رہے اور انجمن زندہ دلان، شاخ ممبئی کے صدر بھی۔ انھیں مہاراشٹر اردو اکادمی کا 'ادبی خدمات' کا ریاستی ایارڈ سے نوازا گیا۔ 1884ء میں غالب انسٹیٹیوٹ، دلّی سے غالب ایوارڈ برائے طنز و مزاح بھی تفویض کیا گیا۔ یوسف ناظم نے پاکستان، امریکہ اور مسقط کا سفر کیا۔ پاکستان اور مسقط کا سفر ظرافت نگاروں کی کانفرنس کے سلسلے میں کیا جب کہ امریکہ کا سفر ان کا ذاتی سفر تھا۔ اپنے دوستوں، رشتہ داروں اور قارئین کو زیر لب مسکرانے اور قہقہے لگانے پر مجبور کرنے والے یوسف ناظم 23/ جولائی 2009ء کو اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

یوسف ناظم اردو طنز و مزاح کا ایک رخشندہ نام ہے۔ ان کے گھر پر ہمیشہ محفلیں جمتی تھیں۔ کبھی ادبی نشستیں، کبھی مشاعرے۔ وہ بات کرتے کرتے ہی ہنسی کی پھلجڑیاں چھوڑتے تھے۔ کبھی کبھی تو یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا کہ وہ سچ کہہ رہے ہیں یا مذاق کر رہے ہیں۔ یہی مزاح ان کی تحریر کی زینت ہے کہ قاری مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ یوسف ناظم کا سن پیدائش کیا ہے؟

۲۔ طالب علمی کے زمانے میں یوسف ناظم کو کن کھیلوں سے دلچسپی تھی؟

۳۔ یوسف ناظم کے والد انھیں کیا بنانا چاہتے تھے؟

3.3.2 یوسف ناظم کی ادبی خدمات

یوسف ناظم ۔۔۔۔طنز و مزاح نگاروں میں ایک معتبر نام ہے۔انھوں نے شاعری کا آغاز طالبِ علمی کے زمانے سے ہی غزل سے کیا تھا۔اورنگ آباد کالج سے ایک نایاب رسالہ 'نورس' شائع ہوتا تھا جس کے کچھ شماروں میں ان کی نظمیں شائع ہوئی ہیں۔لیکن بقول یوسف ناظم :

''شاعری بھی کی۔کوئی مجموعہ مرتب نہیں کیا۔''

بقول پروفیسر عبدالستار دلوی :

''ناظم صاحب ایک اچھے شاعر بھی ہیں، لیکن نثر کے برعکس ان کی شاعری میں غیر معمولی سنجیدگی ہے۔''

پروفیسر عبدالستار دلوی مزید قمطراز ہیں :

''اگر انھوں نے شاعری کو اسی تیز رفتاری سے برتا ہوتا تو جس طرح آج وہ ہمارے اچھے خوش اسلوب ادیب ہیں، وہیں وہ بہت کامیاب ہی نہیں بلکہ عالی مقام شاعر ثابت ہوتے اور ان کی نثر کی اہمیت ثانوی ہوتی۔''

ایم۔اے کے ظریفانہ ادب پر مکمل کیے ہوئے مقالے سے ان کی تحریری زندگی کا آغاز 44-1943ء سے غیر افسانوی صنف طنز و مزاح نگاری سے ہوا۔ملازمت میں رہتے ہوئے انھوں نے بچوں کے لیے بھی لکھا اور منظوم ترجمے بھی کیے۔ یوسف ناظم کی ادبی خدمات کی تفصیلات حسبِ ذیل ہیں :

(الف) یوسف ناظم کی تصانیف میں مضامین کے مجموعے بھی ہیں اور خاکے بھی۔

کیف وکم	فٹ نوٹ	دیوارِیے	زیرِغور	ذکرِخیر (خاکے)
البتہ	بالکلیات	فی الحال	فی الحقیقت	سایۂ ہمسایے (خاکے)
فی زمانہ	فی البدیہہ	منجملہ	ورنہ	امریکہ میری نظر میں (سفرنامہ)
فی الفور	فقط	علیک سلیک		

(ب) یوسف ناظم نے صرف بڑوں کے لیے ہی اپنا قلم نہیں اٹھایا بلکہ انھوں نے ادب اطفال کو بھی روشنی بخشی۔

پلک نہ مارو مرغی کی چار ٹانگیں گاندھی جی جنوبی افریقہ میں
بکرے کی تعریف میں الف سے یے تک

(ج) مضامین، خاکے اور بچوں کے لیے کتابیں ترتیب دینے کے علاوہ یوسف ناظم نے منظوم ترجمے بھی کیے جو حسبِ ذیل ہیں :

۱۔ ارمغان سنسکرت (بھرتری ہری کی نظمیں)
۲۔ نوائے کبیر (کبیر کے دوہے اور گیت)

(د) یوسف ناظم کی تالیفات پر بھی ایک نظر۔۔

۱۔ کتاب نما : وجد نمبر ۲۔ شگوفہ : ہندوستانی مزاح نمبر
۳۔ امکان : عزیز قیسی نمبر ۴۔ سہ ماہی تکمیل : شاذ تمکنت نمبر (دومرتبہ)۔۔۔۔عزیز قیسی نمبر

اردو میں طنز و مزاح نگاری کو پروان چڑھانے میں یوسف ناظم نے اپنی زندگی کا طویل حصہ صرف کیا۔ وہ لوگوں کے دکھ درد کا علاج اپنی تحریر سے کرتے تھے۔ عام آدمی کتاب کا مطالعہ کر کے محظوظ نہیں ہو پاتا ہے، لہٰذا یوسف ناظم ممبئی کے روزنامہ 'انقلاب' میں عرصے تک 'تواریے' لکھتے رہے اور عام آدمی کو بھی زیرِ لب مسکرانے اور وقتی طور پر اپنی پریشانیوں سے دور رہنے پر مجبور کرتے رہے۔ یہی ان کی تحریر کا وصف رہا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ یوسف ناظم کی تحریری زندگی کا آغاز کس غیر افسانوی صنف سے ہوا؟
۲۔ یوسف ناظم کے خاکوں کے مجموعوں کے نام لکھیے۔
۳۔ یوسف ناظم کے سفرنامے کا کیا نام ہے؟

3.4 مشتاق احمد یوسفی

3.4.1 مشتاق احمد یوسفی کی حیات

اردو کے مشہور طنز و مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی 4/اگست 1923ءکوٹونک،راجستھان میں پیدا ہوئے۔ان کے والد یوسف زئی پٹھان تھے لہٰذا اسی مناسبت سے وہ اپنے نام کے ساتھ یوسفی لگاتے تھے جب کہ ننھیال سے راجپوت (راٹھور) تھے۔مشتاق احمد یوسفی کے والد عبدالکریم ریاست جے پور کے پہلے گریجوئیٹ تھے۔مشتاق احمد یوسفی نے ابتدائی تعلیم ٹونک ہی میں حاصل کی،جے پور سے میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔مہاراجہ کالج جے پور(راجپوتانہ بورڈ) سے فرسٹ کلاس فرسٹ سے انٹرمیڈیٹ پاس کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔گولڈ میڈل حاصل کرنے والے وہ پہلے مسلمان طالب علم تھے۔1943ء میں انھوں نے انگریزی،تاریخ اور فلسفہ میں اول درجے میں بی۔اے پاس کیا اور انگریزی میں ریکارڈ قائم کرنے پر انھیں کرنل اوگلوی گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔یہ میڈل حاصل کرنے والے بھی مشتاق احمد یوسفی پہلے مسلمان گریجوئیٹ تھے۔انھوں نے 1945ء میں مسلم علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم۔اے او ایل۔ایل۔بی کی سند حاصل کی۔ 1946ء میں پرونیشنل سول سروس(PSC) میں ان کا انتخاب ہوا اور 1949ء تک ڈپٹی کمشنر اور ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔یکم جنوری 1950ء کو یہ عہدا اور اعزازات چھوڑ کر انھوں نے پاکستان ہجرت کی۔پاکستان میں مشتاق احمد یوسفی کی ملاقات محمد علی جناح کے احباب میں سے ایل ایم۔اے۔اصفہانی سے ہوئی۔اصفہانی صاحب کی مدد سے یوسفی صاحب کا تقرر پہلے اور رینٹ ائیر ویز اور بعد میں بینک میں ہوا۔ 40 برس تک وہ بینک میں ملازمت کرتے رہے۔

(Bank Credit & Commerce International) BCCI کے ایڈوائزر کی حیثیت سے مشتاق احمد یوسفی نے 90-1979ء تک فرائض انجام دئے اور 1990ء میں پاکستان لوٹ گئے۔انھوں نے اپنی زندگی میں کئی اسفار کیے۔ 94 برس کی عمر میں 20/جون 2018ء کو انھوں نے وفات پائی۔

<u>اپنے مطالعے کی جانچ</u>

ا۔ کس مضمون میں ریکارڈ قائم کرنے پر مشتاق احمد یوسفی کو کرنل اوگلوی گولڈ میڈل سے نوازا گیا؟

۲۔ کس سن تک مشتاق احمد یوسفی ڈپٹی کمشنر اور ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے؟

۳۔ مشتاق احمد یوسفی کا سن وفات لکھیے۔

3.4.2 مشتاق احمد یوسفی کی ادبی خدمات

مشتاق احمد یوسفی کی شخصیت اردو طنز و مزاح نگاروں میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ان کے مضامین کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔وہ کسی بھی تنظیم یا تحریک کے نہیں تھے اور نہ ہی انھوں نے سستی شہرت کہ کبھی خواہش اور کوشش نہیں کی۔مشتاق احمد یوسفی نے انسانی زندگی اور معاشرے کی خامیوں کا ذکر طنز و مزاح کے پیرائے میں اس خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے کہ رشید احمد صدیقی اور اور پطرس بخاری کے بعد تیسرے بڑے ظرافت نگار تسلیم کیے گئے۔

مشتاق احمد یوسفی کا پہلا مضمون 'صنفِ لاغر' ماہنامہ سویرا میں 1955ء میں شائع ہوا۔علاوہ ازیں ہفت روزہ 'نصرت'، ماہنامہ 'افکار'، ادبی مجلہ 'ادبی دنیا'، سہ ماہی 'فنون' اور روزنامہ جنگ میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی کی طنزیہ و مزاحیہ مضامین پر مشتمل تصنیفات حسبِ ذیل ہیں :

ا۔ چراغ تلے 1961ء

مشتاق احمد یوسفی کے مضامین، کا یہ مجموعہ نسبتاً زیادہ مزاحیہ رنگ لیے ہوئے ہے۔کتاب کے باہری اور پہلے صفحے پر قوس میں خود لکھا ہے: (کھٹ مٹھے مضامین)۔اس لحاظ سے 'چراغ تلے' کو مزاحیہ مضامین کا مجموعہ بھی کہہ سکتے ہیں۔اس کتاب کے مقدمے کو عنوان دیا ہے؛ پہلا پتھر۔اس مجموعے میں بارہ مضامین ہیں، جن کے عنوانات یہ ہیں :

پڑیئے گر بیمار	کافی	یادش بخیر	موذی
سنہ	جنون لطیفہ	چار پائی اور کلچر	اور آنا گھر میں مرغیوں کا
کرکٹ	صنف لاغر	موسموں کا شہر	کاغذی ہے پیرہن

۲۔ خاکم بدہن 1969ء

اس کتاب کا دیباچہ 'دستِ زلیخا' کے نام سے ہے اور اس میں آٹھ مضامین شامل ہیں۔اس کتاب کے مضامین طنز کے ساتھ مزاح کی چاشنی لیے ہوئے ہیں۔ان مضامین کو انھوں نے خاکے اور مزاحیے کا نام دیا ہے۔اس کتاب میں شامل مضامین کے نام ہیں :

صبغے اینڈ سنز	سیزر، ماتاہری اور مرزا	بارے آلو کا کچھ بیاں ہو جائے	پروفیسر
ہوئے مر کے ہم جو رسوا	ہل اسٹیشن	بائی فوکل کلب	چند تصویرِ بتاں

۳۔ زرگزشت 1973ء

'زرگزشت' مشتاق احمد یوسفی کی سوانح نوعمری ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ 'تزک یوسفی' کے عنوان سے ہے اور اس کے مختلف ابواب یہ ہیں :

سبق یہ تھا پہلا کتابِ ربا کا	رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا	علم دریاؤ
پروٹوکول	فینی ڈارلنگ
کوئی قلزم، کوئی دریا، کوئی قطرہ مدد دے!	جانا ہمارا کاک ٹیل پارٹی میں
ناٹک	موصوف	موصوفہ

۴۔ آبِ گم 1994ء

مشتاق احمد یوسفی کی چوتھی تصنیف 'آبِ گم' ہے۔ اس تصنیف کا پیش لفظ 'غنودیم غنودیم' کے عنوان سے ہے، جسے انھوں نے (پس و پیش لفظ) کہا ہے۔ تصنیف 'آبِ گم' دراصل پانچ کہانی نما خاکوں پر مشتمل ہے جن کے ابواب یہ ہیں :

حویلی	اسکول ماسٹر کا خواب	کار، کابلی والا اور الہ دین بے چراغ
شہر دو قصہ	دھیرج گنج کا پہلا یادگار مشاعرہ

انعامات واعزازات:

۱۔ مشتاق احمد یوسفی کی دوسری تصنیف 'خاکم بدہن' کو آدم جی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

۳۔ تیسری تصنیف 'زرگزشت' کو بھی آدم جی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

۴۔ چوتھی تصنیف 'آبِ گم' نے ہجرا ایوارد حاصل کیا۔

۵۔ مشتاق احمد یوسفی کی مجموعی ادبی خدمات پر انہیں 'ستارۂ امتیاز' سے سرفراز کیا گیا۔

۶۔ 1996ء میں بولان ایوارڈ

۷۔ 2000ء میں کمالِ فن ایوارڈ

۸۔ 2002ء میں انھیں مجموعی علمی وادبی خدمات پر 'ہلالِ امتیاز' سے سرفراز کیا گیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ 'آبِ گم' کے پیش لفظ کو مشتاق احمد یوسفی نے کیا عنوان دیا ہے؟

۲۔ مشتاق احمد یوسفی کو کن امتیازات سے سرفراز کیا گیا؟

۳۔ 'خاکم بدہن' میں شامل مضامین کے نام لکھیے۔

3.5 پروفیسر نورالعین علی

3.5.1 پروفیسر نورالعین علی کی حیات

پروفیسر نورالعین علی اردو ڈرامے کا ایک مشہور نام ہے۔انھوں نے کئی ڈرامے تخلیق کیے۔ان کا تعلق بچوں کے مشہور شاعر اسمٰعیل میرٹھی کے خاندان سے رہا ہے۔ وہ 27/فروری 1930ء کو امراوتی (مہاراشٹر) میں پیدا ہوئیں۔ امراوتی ہی میں ان کی اسکولی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ودربھ مہاودھیالیہ (امراوتی) سے انھوں نے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔بی۔اے میں ان کی کامیابی اس لحاظ سے قابل تعریف ہے کہ اس سال ناگپور یونیورسٹی کے بی۔اے، بی۔ایس۔سی اور مسلم طلبہ میں انھوں نے سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے تھے۔اس کامیابی پر مسز نورالعین علی کو خان بہادر ایچ۔ایم۔ ملک 'گولڈ میڈل' سے نوازا گیا۔علاوہ ازیں اختیاری پرچہ 'جدید ہندوستانی' لینے والے طلبہ میں بھی سب سے زیادہ نمبر

حاصل کرنے پر 'سر آرتھر بلیز ہیسٹ میموریل سلور میڈل' بھی ملا۔

بی۔اے کے بعد انھوں نے گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول (امراوتی) میں معلمہ کے فرائض انجام دیے۔معلمہ کے فرائض انجام دیتے ہوئے انھوں نے اسکول کے سالانہ جلسوں کے لیے ڈرامے لکھے اور اسٹیج کیے۔ڈراموں کا شوق ان کے تدریسی فرائض انجام دیتے ہوئے نہیں ہوا بلکہ اپنے بچپن ہی سے انھیں ڈراموں نے متاثر کیا تھا۔چوتھی جماعت کی ننھی بچی نورالعین جب اسکول میں ڈراما دیکھتی تو کہتی :

''لو جی! یہ ہے ڈراما! یہ تو میں بھی کرسکتی ہوں۔''

اور پھر والد کی اجازت اور توجہ سے نورالعین نے اپنی درسی کتاب سے 'راجا ہریش چندر' پر دیے گئے ڈرامے کا ایک واقعہ اسٹیج کیا۔

ان کا تقرر سیکنڈری ٹریننگ کالج ،ممبئی میں بحیثیت لیکچرار ہوا اور وہ 1968ء میں اپنے شوہر ریاست علی صاحب کے ساتھ ممبئی آ گئیں۔انھوں نے پرائیویٹ طور پر ایم۔اے اور ایم۔ایڈ کی ڈگری بھی حاصل کی۔دورانِ ملازمت پروفیسر نورالعین علی نے آکاش وانی پر بھی پچاس سے زائد ڈرامے اور خاکے لکھ کر خود اپنی آواز میں نشر کیے ہیں۔انھیں مطالعے کا بہت شوق تھا۔شاید ہی کوئی اچھی اور معیاری کتاب ان کے مطالعے سے نہ گزری ہو۔اردو کے علاوہ انھیں انگریزی ناولوں کے مطالعے کا بھی شوق تھا۔

پروفیسر نورالعین علی استاذالاساتذہ تھیں۔ان کے تربیت یافتہ استاد نہایت خوش اسلوبی سے مختلف اسکولوں میں تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔پروفیسر نورالعین علی نیک اور سچ بولنے اور سچ بولنے والوں کو پسند کرنے والی خاتون تھیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ

ا۔ پروفیسر نورالعین علی کا سن پیدائش کیا ہے؟

۲۔ طالب علمی کے زمانے میں پروفیسر نورالعین علی نے درسی کتاب سے کون سا ڈراما کھیلا؟

۳۔ پروفیسر نورالعین علی کا تقرر ممبئی کے کس کالج میں بحیثیت لیکچرار ہوا؟

3.5.2 پروفیسر نورالعین علی کی ادبی خدمات

پروفیسر نورالعین علی نے اپنے ڈراموں میں مقصدیت کو ترجیح دی ہے اور ڈراموں میں کسی نہ کسی معاشرتی مسئلے کو پیش کیا ہے۔وہ ہمیشہ آزادیٔ نسواں کی حامی رہی ہیں لیکن انھیں عورتوں کی بے جا آزادی سخت ناپسند تھی۔انھوں نے اپنے

ڈراموں میں عورتوں کی بے جا پابندی کے خلاف آواز اٹھائی ہے تو اس اس کے ساتھ ہی مرد و زن کے رشتے میں توازن کو بھی اہمیت دی ہے۔ بقول پروفیسر نورالعین علی :

''میں نے تو اپنے زیادہ تر ڈراموں میں عورت کے مسائل سے بحث کی ہے۔
عورت کو اپنے طور پر کردار بنا ےا ہے۔ پس منظر، ماحول، مفروضات، سماجی
سروکار۔۔ یہ تمام میرے یہاں آئے ہیں۔''

پروفیسر نورالعین علی کی ادبی خدمات پر ایک نظر :

(الف) ڈرامے :

ا۔ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول (امراوتی) میں معلمہ کے فرائض انجام دیتے ہوئے جو ڈرامے لکھے اور اسٹیج کیے، ان ہی ڈراموں کا مجموعہ 'بہو کی تلاش اور دوسرے ڈرامے' کے نام سے 1965ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں شامل ڈراموں کے نام ہیں :

کشمیر کی سیر	رہنے کو گھر نہیں ہے	بہو کی تلاش
بھوک ہڑتال	ہلدی گھاٹی کے بعد	

۲۔ پروفیسر نورالعین علی نے نکڑ ناٹک 'درشٹا کرم ویر' لکھا۔ یہ نکڑ ناٹک مہاراشٹر کے دانشور اور سماجی مصلح پدم بھوشن ڈاکٹر بھاؤ راؤ پاٹل کی زندگی پر مبنی ہے۔ اس کا ترجمہ مراٹھی زبان میں این۔ کے۔ پٹولیہ نے کیا ہے۔ یہ نکڑ ناٹک اسٹیج بھی ہوا ہے۔

۳۔ آل انڈیا ریڈیو، ممبئی کے ایک پروگرام 'جگت ناری' کے لیے تقریباً پچاس ڈرامے لکھے۔

۴۔ سوچ لیجیے 1989ء (فل لینتھ ڈراما)

اس مجموعے میں ڈراما 'سوچ لیجیے' کے ساتھ پانچ یک بابی ڈرامے شامل ہیں :

منزل ہے کہاں تیری	جیون ساتھی	ہاتھی کے دانت
کس کے لیے	مانگے کا اجالا	

۵۔ کینسر 1995ء (ڈراما)

۶۔ وہ بولتے کیوں نہیں 2000ء
اس مجموعے میں نو سے پندرہ سال کے بچوں کے لیے چار ڈرامے شامل ہیں :
تیتری اُڑ کڑیا کمل سوزی

۷۔ ہے کوئی راستہ 2002ء (ڈراما)
۸۔ سراب 2004ء (ڈراما)

(ب) انعامات :

۱۔ ساہتیہ کلا پریشد، دلّی کے منعقدہ چارز بانوں کے ڈراموں کی اسکرپٹ کے مقابلے میں ان کے ڈرامے 'سوچ لیجیے' نے اول انعام حاصل کیا۔
۲۔ دو سال بعد اسی مقابلے میں ڈراما 'کینسر' پر اول انعام حاصل کیا۔ اس ڈرامے کو ممبئی یونیورسٹی اور ناگپور یونیورسٹی نے اپنے نصاب میں شامل کیا۔
۳۔ اسکرپٹ رائٹنگ کے ایک اور مقابلے میں ڈراما 'ہے اور کوئی راستہ' کو انعام کا مستحق ٹھہرایا گیا۔

(ج) اسکولی نصاب :

پروفیسر نور العین علی نے مختلف جماعتوں کی تدریسی کتب کے لیے کہانیاں، مضامین، نظمیں، ڈرامے وغیرہ لکھے۔ ڈراموں کے مجموعے 'سوچ لیجیے' میں شامل پانچ ڈراموں میں سے ایک ڈراما 'مانگے کا اجالا' اردو نصابی کتاب بال بھارتی میں بھی شامل کیا گیا۔ پہلے وہ مہاراشٹر کی ایس۔ ایس۔ سی بورڈ کی آٹھویں جماعت کی اردو کی نصابی کتاب 'بال بھارتی' کی مجلس ادارت میں شامل تھیں اور ایک سال بعد بال بھارتی کی لسانی کمیٹی کی ممبر ہوئیں پھر اپنی قابلیت، خوش اسلوبی اور کام کے تئیں ایمانداری کا لوہا منوا کر 1984 ء میں پونے کے 'ادارۂ بال بھارتی' کی اردو لسانی کمیٹی کی چیر پرسن ہو گئیں۔ پروفیسر نور العین علی نے تقریباً تیس برس اسکول کی نصابی کتابوں کی تیاری کے فرائض انجام دیے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ پروفیسر نورالعین علی نے اپنے ڈراموں میں کس چیز کو ترجیح دی ہے؟
۲۔ پروفیسر نورالعین علی کے ڈراموں کے مجموعوں کے نام لکھیے۔
۳۔ پروفیسر نورالعین علی کے نکڑ ناٹک کا کیا نام ہے؟

3.6 خلاصہ

مشہور طنز و مزاح نگار یوسف ناظم کا نام سید محمد یوسف تھا اور تخلص ناظم۔ وہ اپنے قلمی نام 'یوسف ناظم' سے اردو ادب کی غیر افسانوی صنف طنز و مزاح میں مقبول و مشہور ہوئے۔ وہ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے چار سال ممبر سکریٹری رہے اور انجمن زندہ دلان، شاخ ممبئی کے صدر بھی۔ ان کی تحریری زندگی کا آغاز 44-1943ء سے غیر افسانوی صنف طنز و مزاح نگاری سے ہوا۔ یوسف ناظم کی تصانیف میں مضامین کے مجموعے بھی ہیں اور خاکے بھی، ادب اطفال کو بھی روشنی بخشی اور منظوم ترجمے بھی کیے۔ یوسف ناظم کا انتقال 23/جولائی 2009ء کو ممبئی میں ہوا۔

مشہور طنز و مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی 4/اگست 1923ء کو ٹونک، راجستھان میں پیدا ہوئے۔ 1946ء میں پروینشل سول سروس (PSC) میں ان کا انتخاب ہوا اور 1949ء تک ڈپٹی کمشنر اور ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ یکم جنوری 1950ء کو یہ عہدا اور اعزازات چھوڑ کر انھوں نے پاکستان ہجرت کی۔ وہاں 40 برس تک وہ بینک میں ملازمت کرتے ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کا پہلا مضمون 'صنفِ لاغر' ماہنامہ سویرا میں 1955ء میں شائع ہوا۔ علاوہ ازیں ہفت روزہ 'نصرت'، ماہنامہ 'افکار'، ادبی مجلہ 'ادبی دنیا'، سہ ماہی 'فنون' اور روزنامہ جنگ میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی کی طنزیہ و مزاحیہ مضامین پر مشتمل چار تصنیفات ہیں۔

پروفیسر نورالعین علی اردو ڈرامے کا ایک مشہور نام ہے۔ بی۔ اے کے بعد انھوں نے گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول (امراوتی) میں معلمہ کے فرائض انجام دیے۔ معلمہ کے فرائض انجام دیتے ہوئے انھوں نے اسکول کے سالانہ جلسوں کے لیے ڈرامے لکھے اور اسٹیج کیے۔ ان کا تقرر سیکنڈری ٹریننگ کالج ممبئی میں بحیثیت لیکچرار 1968ء میں ہوا۔ ان کے تین فل لینتھ ڈرامے اور ڈراموں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ سکنڈری ٹریننگ کالج میں تدریسی فرائض انجام دیتے ہوئے 'ادارۂ بال بھارتی' کی اردو لسانی کمیٹی کی چیر پرسن کی ذمہ داری بھی نبھائی۔ پروفیسر نورالعین علی نے تقریباً تیس برس اسکول کی نصابی کتابوں کی تیاری کے فرائض انجام دیے۔

3.7 نمونہ امتحانی سوالات

(الف) مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

۱۔ یوسف ناظم کی شاعری سے دلچسپی پر اپنی معلومات پیش کیجیے۔

۳۔ مشتاق احمد یوسفی کے مضامین کن رسائل میں شائع ہوتے تھے؟

۳۔ پروفیسر نور العین علی کے ڈراموں کا کیا مقصد رہا ہے؟

(ب) مندرجہ ذیل سوالات کے تفصیلی جوابات لکھیے۔

۱۔ یوسف ناظم کی ادبی خدمات پر نوٹ لکھئے۔

۲۔ پروفیسر نور العین علی کی حیات اور ادبی خدمات پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

۳۔ مشتاق احمد یوسفی کی حیات پر اپنی معلومات کا اظہار کیجئے۔

3.8 فرہنگ

دانشور	عقل مند
سماجی مصلح	معاشرے کی اصلاح کرنے والا
استاذ الاساتذہ	استادوں کا استاد
حامی	حمایتی، مددگار
ادبِ اطفال	بچوں کا ادب
مجلّہ	رسالہ، میگزین
سند	سرٹیفکیٹ

3.9 معاون کتابیں

یوسف ناظم نمبر، ماہنامہ شگوفہ، حیدرآباد — مدیر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

گوشہ: پروفیسر نورالعین علی ، سہ ماہی رسالہ ترسیل، ممبئ — مدیر : پروفیسر یونس اگاسکر

سوچ لیجیے — از — پروفیسر نورالعین علی

سراب — از — پروفیسر نورالعین علی

مشتاق احمد یوسفی: ایک مطالعہ — مرتبہ — ڈاکٹر مظہر احمد

چراغ تلے

خاکم بدہن

زرگزشت

آب گم

☆☆☆

اکائی۔ 4 : فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، اختر الایمان

ساخت :

4.1 اغراض ومقاصد

4.2 تمہید

4.3 نفیض احمد فیض، مخدوم مھی الدین اوراختر الایمان کا عہد

4.4 فیض احمد فیض

4.4.1 فیض کی حیات وشخصیت اورادبی خدمات

4.4.2 فیض کی نظم نگاری

4.5 مخدوم مھی الدین

4.5.1 مخدوم کی حیات وشخصیت اورادبی خدمات

4.5.2 مخدوم کی نظم نگاری

4.6 اختر الایمان

4.6.1 اختر الایمان کی حیات وشخصیت اوردبی خدمات

4.6.2 اختر الایمان کی نظم نگاری

4.7 خلاصہ

4.8 نمونۂ امتحانی سوالات

4.9 فرہنگ

4.10 معاون کتابیں

4.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو اردو کے تین بڑے شعراء فیض، مخدوم اور اختر الایمان کی شاعری خصوصاً نظم نگاری سے واقف کرانا ہے۔ ان تینوں شاعروں کا عہد ایک ہی ہے۔ اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ کو فیض، مخدوم اور اختر الایمان کی سوانح حیات سے متعلق معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ آپ ان شعراء کی شخصیت سے واقفیت حاصل کریں گے اور ان کی شاعری کی امتیازی خصوصیات سے روشناس ہوں گے۔ ان کی دیگر علمی و ادبی خدمات کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں گی من جملہ اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ فیض، مخدوم اور اختر الایمان کی حیات، شخصیت، عہد اور ان کی شاعرانہ خصوصیات پر اظہار خیال کر سکیں۔ ان کی نظموں کا مطالعہ کر کے نہ صرف محظوظ ہوں گے بلکہ ان سے شعور و آگہی بھی حاصل کریں گے۔

4.2 تمہید

اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ترقی پسند تحریک نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ اس دور میں کئی اہم اور بڑے شاعروں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے فنی تجربات کے ذریعے اردو نظم میں تنوع پیدا کیا اور اردو میں نظم کی روایت کو استحکام و بلندی عطا کی۔ نیز ان شعراء نے اپنی شاعری کے ذریعے عوام میں سماجی و سیاسی شعور بیدار کرنے کی کوشش کی۔ یوں تو ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعراء کی فہرست بڑی طویل ہے لیکن یہاں ہم اس دور کے تین اہم شعراء فیض، مخدوم اور اختر الایمان کے عہد، ان کے حالات زندگی، شخصیت اور شاعری سے متعلق معلومات حاصل کریں گے۔

4.3 فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین اور اختر الایمان کا عہد

بیسویں صدی دنیا بھر میں انقلابات کی صدی تصور کی جاتی ہے۔ دنیا کے کئی ممالک میں شہنشاہیت کا خاتمہ ہوا، مذہبی اجارہ داری کے خلاف تحریکیں چلائی گئیں، سرمایہ داری اور جاگیردارانہ نظام کو ختم کرنے کے لیے کوششیں ہونے لگیں، سامراجیت سے آزادی کی جدوجہد برسوں کے بعد کامیابی سے ہمکنار ہوئی، دو عظیم جنگوں نے دنیا کے نظام کو دہلا دیا تھا۔ ایسے میں ادیبوں نے عوام میں سیاسی، سماجی شعور کو بیدار کرنے کے لیے قلم کا سہارا لیا نتیجے میں ادب میں حقیقت پسندی کا چلن عام ہونے لگا۔ انقلابی ادب تخلیق ہونے لگا۔ ہندوستان میں بھی ترقی پسند تحریک کا قیام عمل میں آیا۔ تمام اہم اور بڑے قلم کار اس سے وابستہ ہو گئے۔ اس کے منشور کے پیش نظر شاعری کرنے لگے۔ اس تحریک سے

وابستہ شعرا کی ایک طویل فہرست ہے جس میں فیض اور مخدوم شامل ہیں۔اختر الایمان کا عہد بھی تقریباً یہی ہے۔لیکن وہ باضابطہ طور پر اس انجمن کے رکن نہیں تھے۔ان کے کلام میں موجود عصری حسیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں سے پوری طرح سے واقف تھے۔اور اپنی شاعری میں اپنے عہد کی عکاسی کی ہے۔فیض ،مخدوم اور اختر الایمان ہم عصر شاعر ہیں۔تینوں نے تقریباً ایک ہی زمانہ دیکھا۔اپنے عہد کے موضوعات کو اپنی شاعری میں مختلف و منفرد انداز میں پیش کیا۔

4.4 فیض احمد فیضؔ

4.4.1 فیضؔ کی حیات اور ادبی خدمات

حیات :

فیض احمد فیض کا اصل نام فیض احمد خاں تھا۔ان کی پیدائش ۱۳رفروری ۱۹۱۱ء کو سیالکوٹ میں ہوئی۔فیض کے والد کا نام سلطان محمد خاں تھا۔ان کے جد امجد اسین پال نام کے ایک راجپوت راجا کے خاندان سے تھے۔اس خاندان کے ایک فرد نے اسلام قبول کرلیا اور اسی سلسلے میں فیض کے دادا پردادا پیدا ہوئے۔فیض کی والدہ کا نام سلطان فاطمہ تھا۔ان کو کل ۹ اولادیں ہوئیں۔فیض کے والد کا شمار اس وقت سیالکوٹ کے رئیسوں میں ہوتا تھا۔ان کے دوستوں میں علامہ اقبال، سر عبدالقادر، سر شفیع، سید سلیمان ندوی، اور ڈاکٹر ضیاء الدین جیسے اکابرین شامل تھے۔انہیں تعلیم سے بے حد دلچسپی تھی اسی لیے انہوں نے فیض کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی۔فیض کی تعلیم کا آغاز مشرقی طرز پر ہوا۔انہوں نے اپنے محلے کے مسجد میں شیخ حسام الدین سے قرآن کا درس لیا اور قرآن کے کچھ سپارے حفظ بھی کیے لیکن آگے چل کر یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔مگر عربی وفارسی زبان وادب کی باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔۱۹۲۱ء میں سیالکوٹ کے اسکاچ مشن ہائی اسکول کی چوتھی جماعت میں داخل کرایا گیا۔اسی کالج سے ۱۹۲۷ء میں میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں کامیاب کیا۔۱۹۲۹ء میں مرے کالج آف سیالکوٹ سے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں درجۂ امتیاز حاصل کیا۔اسی کالج کی تعلیم کے دوران علامہ اقبال کے استاد شمس العلماء مولوی سید میر حسن سے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔۱۹۲۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔اے آنرز میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۱ء میں پاس کیا۔۱۹۳۳ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم۔اے کیا اور ۱۹۳۴ء میں اورینٹل کالج لاہور سے عربی میں ایم۔اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔۱۹۳۵ء میں امرتسر کے ایم اے او کالج میں بحیثیت لیکچرر فیض کی تقرری ہوئی۔پانچ سال تک خدمات انجام دیتے

رہے۔فیض کی ادبی زندگی میں ایک نیا موڑ تب آیا جس وقت وہ امرتسر کے ایم اے او کالج میں لیکچرر تھے اور ان کی ملاقات صاحبزادہ محمودالظفر سے ہوئی۔محمودالظفر اس وقت ایم اے او کالج کے وائس پرنسپل تھے۔انہیں اور ان کی بیگم رشید جہاں کو ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ان دونوں سے ملاقات کے بعد فیض اشتراکیت کے مطالعے کی طرف راغب ہوئے۔انہوں نے ترقی پسند مصنفین کے مینی فیسٹو کو پڑھا اور اس سے بہت متاثر ہوئے اور ان کی طرز فکر میں ایک انقلاب سا رونما ہوگیا۔وقت کے تقاضوں کے پیش نظر انھوں نے اپنے قلم کو سامراجیت سے آزادی حاصل کرنے اور عوام میں سماجی شعور بیدار کرنے لے لیے وقف کردیا۔رومانیت سے انقلابیت کی طرف آتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

فیض انجمن ترقی پسند میں شامل ہوگئے۔جب ۱۹۳۶ء میں سجاد ظہیر امرتسر آئے تو وہاں سے لاہور کے سفر میں فیض بھی ان کے ساتھ تھے۔انہیں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پنجاب شاخ کا سکریٹری منتخب کیا گیا۔ ۱۹۴۰ء میں لاہور چلے گئے اور وہاں کے ہیلی کالج آف کامرس میں انگریزی کے لکچرر مقرر ہوئے۔اس کے تقریباً ایک سال بعد فیض کی شادی ۲۸/ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو ایلیس کتھیرین جارج سے ہوئی۔ایلیس کتھیرین جارج کا اسلامی نام کلثوم رکھا گیا۔اور ان کا نکاح کشمیر کے شیخ عبداللہ نے پڑھایا تھا۔فیض کو دو بیٹیاں ہوئیں۔سلیمہ اور منیزہ۔۱۹۴۲ء میں فیض ہیلی کالج آف کامرس سے سبکدوش ہوکر انگریزی فوج میں جنگ کے پبلسٹی ونگ میں کیپٹن کے عہدے پر فائز ہوئے۔۱۹۴۳ء میں فیض کو میجر بنا دیا گیا اور آگے چل کر ۱۹۴۴ء میں انہیں لفٹننٹ کرنل کا عہدہ دیا گیا۔لیکن ان کا دل یہاں بھی نہیں لگا۔دسمبر ۱۹۴۹ء انھوں نے کو استعفیٰ دے دیا۔فیض نے میاں افتخارالدین کی ایما پر پاکستان ٹائمز (انگریزی روزنامہ) کی ادارت سنبھال لی۔فیض نے اپنی ذہانت اور محنت سے انتہائی قلیل مدت میں صحافت کے تمام امور پر دسترس حاصل کرلی اور پاکستان ٹائمز کے ساتھ ساتھ اردو روزنامے ''امروز'' اور ہفتہ روزہ ''لیل ونہار'' کے مدیر بنے۔

۹/ مارچ ۱۹۵۱ء میں فیض کو جنرل ایوب کی سرکار کا تختہ پلٹنے کے سازش کیس میں گرفتار کرکے منٹگمری جیل میں رکھا گیا۔وہاں سے انھوں نے ایلس کو جو خطوط لکھے ان سے ان کی اسیری کی زندگی کے شب وروز سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔یہ خطوط ''صلیبیں میرے دریچے میں'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔۹/ مارچ ۱۹۵۱ء کو جنرل ایوب کی سرکار کا تختہ الٹنے کے کیس میں ڈیڑھ درجن سیاسی لیڈر،فوجی افسروں کے ساتھ فیض اور سجاد ظہیر کو بھی گرفتار کرلیا گیا تھا۔اس وقت فیض پاکستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر تھے۔فیض اس سازش میں بالکل بے گناہ اور بے قصور تھے۔لیکن اسیری مقدر بن گئی۔اسیری کے دوران انھیں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔احباب سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔حتیٰ کہ بہت دنوں

تک وہ قلم بھی استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ یہ اشعار اس زمانے کی یادگار ہیں :

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر اک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

خیر بعد میں لکھنے پڑھنے کی اجازت مل گئی اور فیض نے اس قید و بند کی زندگی میں بہت سی شاہکار نظمیں لکھیں۔ جو شعری مجموعہ ''زنداں نامہ'' میں شامل ہیں۔ فیض ۲۰ /اپریل ۱۹۵۵ء کو رہا ہوئے۔ انھوں نے پہلے چین اور اس کے بعد سویت یونین کا دورہ کیا۔ تاشقند میں ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس ہوئی۔ جس میں ان کی شاعری کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کے بعد ایشیاء اور افریقہ کے ادیبوں کی کانفرنس ہوئی اس میں فیض نے ترقی پسند تحریک کے لیڈر کی حیثیت سے شرکت کی۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں جب فیض لندن سے کراچی (پاکستان) واپس آئے تو وہ دوبارہ سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر لیے گئے۔ چھ مہینے کے بعد رہائی ہوئی۔ فیض پاکستان آرٹ کونسل لاہور کے سکریٹری بنے اور تقریباً تین سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔

فیض پہلے ایشیائی شاعر تھے، جنہیں ۷ ۲ /اگست ۱۹۶۲ء کو لینن امن پرائز ماسکو میں دیا گیا۔ ۱۹۶۴ء میں ''سر عبداللہ ہارون کالج'' کراچی میں فیض کا تقرر بحیثیت پرنسپل ہوا۔ تین سال تک اس عہدے پر اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی انجام دینے کے بعد ۱۹۶۷ء میں سمرقند، بخارا، کوہ قاف، ماسکو، تاشقند وغیرہ کا دورہ کیا اور پھر ایک سال بعد علامہ اقبال پر ایک فلم تیار کی۔ فیض کو غالب اور اقبال سے بڑی عقیدت تھی۔ انھوں نے کراچی میں ایک ادارہ یادگارِ غالب بھی قائم کیا۔ ۱۹۷۹ء میں بیروت میں انگریزی میگزین ''لوٹس'' کی ادارت قبول کر لی اور ۱۹۸۲ء میں مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد فیض کی صحافتی مصروفیات کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

۱۸ /نومبر ۱۹۸۴ء کی شام دل کا شدید دورہ پڑا اور انہیں لاہور کے میٹو ہاسپتال میں داخل کیا گیا۔ دو دن کی شدید علالت کے بعد ۲۰ /نومبر ۱۹۸۴ء کو ایک بج کر پندرہ منٹ پر میٹو ہاسپتال میں فیض کا انتقال ہوا۔

ادبی خدمات :

فیض کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

شعری مجموعے :

(۱) نقش فریادی ۱۹۴۱ء

(۲) دست صبا ۱۹۵۲ء

(۳) زنداں نامہ ۱۹۵۶ء

(۴) دست تہ سنگ ۱۹۶۵ء

(۵) سروادئ سینا ۱۹۷۱ء

(۶) شام شہر یاراں ۱۹۷۸ء

(۷) میرے دل میرے مسافر ۱۹۸۱ء

(۸) غبار ایام

(۹) نسخہ ہائے وفا ۱۹۸۹ء

(۱۰) سارے سخن ہمارے (کلیات) ۱۹۸۲ء

(۱۱) کلیات فیض

نثری مجموعے :

(۱) میزان (تنقیدی مضامین) ۱۹۶۲ء

(۲) صلیبیں میرے دریچے میں (خطوط) ۱۹۷۱ء

(۳) متاع لوح وقلم ۱۹۷۳ء

(۴) سفرنامہ کیوبا ۱۹۷۴ء

(۵) ہماری قومی ثقافت ۱۹۷۶ء

(۶) مہ وسال آشنائی ۱۹۸۰ء

مرتب کردہ :

(۱) اردو شاعری کا انتخاب

(۲) پاکستانی کلچر (اردو اور انگریزی میں)

(۳) اقبال کی شاعری

فیض کی شاعری کا آغاز دس سال کی عمر میں ہو گیا تھا۔لیکن وہ اس وقت والد سے چھپ چھپ کر شاعری کرتے تھے۔فیض دسویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے باقاعدہ مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ان کی شاعری میں عوامی شہرت کا آغاز ۱۹۲۸ء میں مرے کالج کی ادبی تنظیم ''اخوان الصفا'' کے مشاعرے سے ہوا۔اس مشاعرے میں انہوں نے جو غزل پڑھی اس کا یہ شعر بہت مشہور ہوا۔

لب بند ہیں ساقی مری آنکھوں کو پلا دے
وہ جام جو منت کش صہبا نہیں ہوتا

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ فیض کی پیدائش کب ہوئی؟

۲۔ فیض کو لینن امن پرائز کب دیا گیا؟

۳۔ فیض کا پہلا شعری مجموعہ کونسا ہے؟

۴۔ فیض کے خطوط کا مجموعہ کس نام سے شائع ہوا؟

4.4.2 فیض کی نظم نگاری

فیض نے اپنی شاعری کی ابتداء تو غزل سے کی لیکن بعد میں نظم نگاری کی طرف مائل ہوئے اور نظم نگار شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ان کی پہلی نظم ''میرے معصوم قاتل'' ہے۔فیض کی ابتدائی دور کی نظموں میں رومانیت کا غلبہ ہے۔ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے بعد وہ حقیقت پسندی کی طرف راغب ہوئے۔جس کے سبب ایک انقلابی رنگ ابھرنے لگا۔چونکہ وہ بنیادی طور پر رومان پسند تھے اس لیے ان کے یہاں انقلابی شاعری میں بھی رومانیت کی جھلک نظر آتی

ہے۔اس طرح رومانیت اور انقلابیت کی آمیزش فیض کی شاعری کی اہم خصوصیت بن گئی۔فیض نے روایتی شاعری کے استعاروں اور علامتوں کو انقلابیت کا جامہ پہنایا۔پہلی قرأت میں انفرادی جذبات کی عکاس نظر آنے والی ان کی شاعری اجتماعی زندگی اور جدوجہد آزادی کی ترجمان بن گئی۔رومانیت اور انقلابیت کی یہ ہم آہنگی ایک منفرد طرزِ اسلوب کا پتہ دیتی ہے۔''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'' سے یہ بند دیکھیے۔

جب گھلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے ، لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'' میں حقیقی دنیا کے تقاضوں کے پیش نظر شاعر اپنے محبوب کو بھی احساس دلاتا ہے کہ میں اپنے وطن کی آزادی کے لیے جدوجہد میں حصہ لے رہا ہوں،ہمیں اپنی خوشیوں،تمناؤں،اور آرام وآسائش کی قربانیاں دینے ہوں گی تبھی اپنے ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرا سکیں گے۔

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر' کیا کیجیے؟
ا ب بھی دلکش ہے ترا حسن' مگر کیا کیجیے؟
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں ور بھی وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

یہ قربانیاں رنگ لائیں اور آزادی کا سورج طلوع ہوا۔لیکن آزادی کے ساتھ ملک کی تقسیم اور فرقہ وارانہ فسادات نے مجاہدین آزادی کے خوابوں کو چکنا چور کر دیا۔خوشیاں غم میں بدل گئیں۔فیض نے غلامی کو رات کی تاریکی اور آزادی کو صبح کی روشنی جیسی علامتوں کے ذریعے اس درد کو بیان کیا ہے۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

شاعر پر امید ہے کہ وہ دن بھی آئے گا جب ہم سب دیکھیں گے کہ کس طرح مساوات اور انصاف کا بول بالا ہوگا اور خلق خدا کا راج ہوگا۔

فیض کی نظموں میں تنہائی اور انتظار کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔انسان پر انتظار ہی گراں گزرتا ہے اس پر اگر تنہائی کی کیفیت ہو تو درد کی شدت اور بڑھ جاتی ہے۔انتظار آہستہ آہستہ ناامیدی اور مایوسی میں بدلنے لگتا ہے۔نظم ''تنہائی'' ملاحظہ ہو:

پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ فیض نے اپنی شاعری کی ابتدا کس صنف سے کی؟
۲۔ فیض کی پہلی نظم کون سی ہے؟
۳۔ فیض کی نظموں میں کن چیزوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے؟

4.5 مخدوم محی الدین

4.5.1 مخدوم کی حیات اورادبی خدمات

حیات :

مخدوم محی الدین کا اصل نام ابوسعید مخدوم محی الدین خذری ہے ان کی پیدائش ۴ / فروری ۱۹۰۸ء کوضلع میدک کے قصبۂ اندول میں ہوئی۔ ان کے خاندان کا سلسلہ پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کے ایک صحابی حضرت ابوسعید خذری سے ملتا ہے۔ مخدوم کے اجداد میں سے ایک صاحب رشید الدین' شہنشاہ اورنگ زیب کی فوج کے ساتھ اعظم گڑھ سے نقل وطن کر کے حیدرآباد میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام غوث محی الدین تھا جو تعلقہ اندول میں اہلکار تحصیل تھے۔ مخدوم چار برس کے تھے ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ ان کی والدہ کی دوسری شادی کردی گئی۔ مخدوم کی پرورش ان کے چچا بشیر الدین نے کی، جونہایت دیندار اور خداترس انسان تھے۔ ان کی تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مسجد میں حاصل کی دادا کی رہنمائی میں قرآن شریف اور سعدی کی گلستان و بوستان پڑھیں۔ اندول کے ایک اسکول سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد حیدرآباد آگئے۔ سنگاریڈی ہائی اسکول سے ۱۹۲۹ء میں میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ کالج میں داخلہ لیا لیکن حاضری کی کمی کی وجہ سے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ملی۔ ۱۹۳۶ء میں انٹرمیڈیٹ میں کامیابی حاصل کی۔ رشتہ داروں پر بوجھ بننے کا احساس ستانے لگا تو گھر چھوڑ دیا۔ بچوں کو ٹیوشن پڑھاتے، اخبار اور مقبول اداکاروں کی تصویریں بیچ کر گزارا کرنے لگے۔

مخدوم کی شادی ان کے چچا کی لڑکی سے ۲۲ / اگست ۱۹۳۳ء کو ہوئی جن سے تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں۔ انھوں نے ۱۹۳۴ء میں بی۔ اے اور ۱۹۳۶ء میں ایم۔ اے کیا۔ ایم۔ اے کے بعد دفتر دیوانی ملکی مال میں کلرک کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں مخدوم کا سٹی کالج میں بحیثیت استاد تقرر عمل میں آیا۔ ۱۹۴۰ء میں مخدوم کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۱ء میں انھوں نے سٹی کالج کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۴۳ء میں حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی باقاعدہ تشکیل مخدوم کی رہنمائی میں عمل میں آئی۔ انھوں نے یہاں ۱۹۴۵ء میں کل ہند کانفرنس منعقد کی جو بے حد کامیاب رہی۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک کا دور حیدرآباد میں ہنگامی صورت حال رہی۔ مخدوم خود کو انقلابی سرگرمیوں کے لیے وقف کر چکے تھے وہ ٹریڈ یونینوں کے ذریعے مزدوروں میں اپنے حقوق کے تئیں شعور بیدار کر کے انھیں متحد کرنے لگے۔ ان سرگرمیوں کے سبب انھیں کافی وقت روپوشی میں گزارنا پڑا۔ ان کی یہ سرگرمیاں ۱۹۵۱ء تک جاری رہیں۔

ملک کی آزادی کے بعد ۱۹۵۲ء میں منعقد ہوئے عام انتخابات میں حصہ لیا اسمبلی اور پارلیمنٹ دونوں کے لیے امیدوار تھے لیکن اتنی مقبولیت کے باوجود الیکشن ہا گئے۔۱۹۵۶ء میں وہ قانون ساز کونسل کے امیدوار بنے اور مجلس قانون ساز آندھرا پردیش میں اپوزیشن لیڈر منتخب ہوئے۔ دنیا کے مختلف مما لک جیسے چین،سوویت یونین،افریقہ اور مشرقی یورپ ے مما لک کا سفر کیا۔ ۲۵ / اگست ۱۹۶۹ء کو دہلی میں ان کا انتقال ہوااور ۲۶ / اگست کو حیدر آباد میں تدفین عمل میں آئی۔

ادبی خدمات :

مخدوم کی تصانیف درجہ ذیل ہیں۔

(۱)	سرخ سویرا	۱۹۴۴ء	
(۲)	گلِ تر	۱۹۶۱ء	
(۳)	بساطِ رقص	۱۹۶۶ء	
(۴)	انتخاب کلام مخدوم	۱۹۳۹ء	(ادارۂ ادبیات اردو،حیدر آباد)
(۵)	انتخاب کلام مخدوم	۱۹۵۲ء	(انجمن ترقی اردو ہند،علی گڑھ)
(۶)	مخدوم اور کلام مخدوم	۱۹۷۲ء	(کتب پرنٹرز و پبلیشرز، کراچی)

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ مخدوم کا اصل نام کیا ہے۔

۲۔ مخدوم کب کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری منتخب ہوئے؟

۳۔ مخدوم کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

۴۔ مخدوم کے پہلے شعری مجموعے کا نام کیا ہے؟

4.5.2 مخدوم کی نظم نگاری

مخدوم نے جامعہ عثمانیہ میں طالب علمی کے زمانے میں ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ ’’پیلا دوشالہ‘‘ ان کی پہلی نظم ہے ،اس نظم کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔اور پہلی شائع ہونے والی نظم ’’طور‘‘ جو مجنوں گورکھپوری کی ادارت میں نکلنے والے رسالہ ’’ایوان‘‘ میں ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی تھی۔مخدوم کے کلام میں رومانی اور انقلابی دونوں طرح کی نظمیں موجود ہیں۔انھیں محبت

اور محنت کا شاعر کہا جاتا ہے۔انھوں نے اپنی نظم 'شاعر' میں اپنے شعری وژن کی اس طرح سے ترجمانی کی ہے۔

بکھری ہوئی رنگین کرنوں کو آنکھوں سے چن کر لاتا ہوں
فطرت کے پریشاں نغموں سے پھر اپنا گیت بناتا ہوں
فردوس خیالی میں بیٹھا اک بت کو تراشا کرتا ہوں
پھر اپنے دل کی دھڑکن کو پتھر کے دل میں بھرتا ہوں

مخدوم صرف نظریاتی طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں تھے بلکہ انھوں مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کے لیے اور انگریزوں کی غلامی سے آزادی کی جدوجہد میں عملی طور پر حصہ لیا۔انھوں نے جب شعر گوئی کا آغاز کیا یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں انگریز حکمرانوں کے خلاف عوام کا غم وغصہ مختلف تحریکوں کی شکل میں ظاہر ہو رہا تھا۔ادب میں ترقی پسند تحریک کے قیام کے ذریعے عوام میں سیاسی وسماجی شعور بیدار کرنے کی کوشش ہو رہی تھی۔وہ اس وقت کے نوجوانوں کی طرح ایک نیا جہاں بنانے چاہتے تھے جہاں آزادی، مساوات اور خوشحالی ہو۔اپنی نظم ''جہانِ نو'' میں خواہش کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

ایسا جہاں جس کا اچھوتا نظام ہو
ایسا جہاں جس کا اخوت پیام ہو
ایسا جہاں جس کی نئی صبح وشام ہو
ایسے جہاںِ نو کا پروردگار بن

آخری مصرعے میں وہ اپنے ہم وطنوں کو جہد مسلسل کی ترغیب دیتے ہوئے دکھائے دیتے ہیں۔ایک روشن اور تابناک مستقبل کی طرف متحد ہوکر آگے بڑھنے کی دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

حیات لے کے چلو، کائنات لے لے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

مخدوم کی رومانی شاعری کے پیچھے گہرا سماجی احساس ہے جس میں عصری حسیت موجود ہے۔وہ مخدوم کی رومانی شاعری کو بے جان تخیل پرستی اور خوابنا کی نہیں بلکہ بیداری بخشتی ہے۔اس لیے ان کے کلام میں زندگی کا حسن بھی ہے اور تلخ حقیقتیں بھی ہیں۔

زندگی لطف بھی ہے زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی زنجیر کا جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے حسرتِ دیدار بھی ہے
زہر بھی آبِ حیات' لب و رخسار بھی ہے
زندگی دار بھی ہے زندگی دلدار بھی ہے

ان کی رجائیت پسندی انھیں مشکل سے مشکل حالات میں بھی مایوس و ناامید نہیں ہونے دیتی۔حال کی ناآسودگی سے وہ تڑپ جاتے ہیں لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی قنوطیت کا شکار نہیں ہوتے کیونکہ وہ مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔اپنی باعمل زندگی اور جہد مسلسل ہی سے وہ اعتماد حاصل کرتے ہیں انھیں یقین ہے کہ

رات کے ماتھے پر آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے
مرمریں صبح کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام آئے گا
رات ٹوٹے گی اجالوں کا پیام آئے گا

مخدوم کی رومانی نظموں میں جہاں تلگن، انتظار، ساگر کنارے، لمحہ رخصت، جوانی، وہ، طور جیسی خوبصورت نظمیں ہیں۔وہیں جنگ آزادی، حویلی، زلف چلیپا، انقلاب، جانے والے سپاہی سے پوچھو، اندھیرا' اور کہو ہندوستان کی جئے جیسی مقبول عام نظمیں شامل ہیں۔ان کی نظم ''جنگ آزادی'' نے اس زمانے میں مزدوروں، محنت کش طبقے میں ایک انقلابی ترانے کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔مخدوم نے جاگیرداری اور شاہی نظام، سرمایہ داری اور سامراج کے خلاف عوام کو آواز عمل دی ہے۔

یہ جنگ ہے جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

مخدوم کی شاعری میں رومان اور انقلاب کا خوبصورت سنگم بھی پیش کرتی ہے۔ایک نئے نظام کا قیام ان کا سب سے بڑا خواب تھا۔انقلاب اس کی علامت ہے شاعر انقلاب کے جذبے سے سرشار ہے اور ہمہ تن منتظر ہے کہ

اے جانِ نغمۂ جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لیے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجوم شوق سر رہگزار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

مخدوم اپنی نظموں میں بڑے خوبصورت پیکر تراشے ہیں۔ان امیجس کی خوبی یہ ہے کہ جذبے اور الفاظ کے ترنم میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔اوراس ہم آہنگی سے شعر کی معنویت میں اضافہ ہوتا ہے۔نظم ''جانے والے سپاہی سے پوچھو'' سے یہ بند ملاحظہ ہو۔

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے
کون دکھیا ہے جوگ رہی ہے
بھوکے بچوں کو بہلا رہی ہے
لاش جلنے کی بو آ رہی ہے
زندگی ہے کہ چلا رہی ہے

مخدوم محی الدین اپنی شاعری میں نادر تشبیہات واستعارات کواستعمال کرتے ہیں۔نظم 'چاند تاروں کا بن' ان کی اس فنکارانہ جدت پسندی کی روشن مثال ہے۔اس نظم کے لفظ لفظ میں علامتی تاثر اور فکری گہرائی نے نئی قوت پیدا کردی ہے۔

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر
تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے
منتظر مرد وزن

مستیاں ختم، مدہوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن
رات کے جگمگاتے دہکتے بدن

رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا بھی ہے
صبح کا کچھ اجالا، اجالا بھی ہے
ہمدمو!
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

اس نظم میں مخدوم نے ہندوستان کی اجتماعی زندگی کے تین ادوار کو پیش کیا ہے۔ آزادی سے پہلے، بعد اور آگے کی زندگی کو خوبصورت تشبیہات واستعارات کے ذریعے علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ رات کے اندھیرے کو غلامی، صبح کے اجالے کو آزادی، اور خود جل کر دوسروں کے لیے روشنی فراہم کرنے والے محبان وطن کے کے موم، آزادی کے متوالوں کے لیے چاند تاروں کا بن جیسے استعارے وضع کر کے اپنی نظم کو خوبصورت اور موثر بنایا ہے۔ مجاہدین آزادی نے جس آزادی کی آرزو میں اپنے جانیں قربان کر دیں، جیل کی صعوبتیں برداشت کیں، انگریزوں کے ظلم وستم سہے لیکن جب ملک آزاد ہوا تو کچھ متعصب اور مفاد پرست لوگوں کی وجہ سے فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ جنھوں نے آزادی کی صبح کو داغدار کر دیا۔ وہ خواب ادھورے رہ گئے جو مجاہدین آزادی نے دیکھے تھے۔ شاعر منزل مقصود تک پہنچنے کی ترغیب دلاتے ہوئے نظم کو ایک پر امید موڑ پر ختم کرتا ہے۔ مخدوم اور فنی خوبیوں کے سبب اردو نظم کی روایت کا اہم حصہ رہیں گے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ طالب علمی کے زمانے میں مخدوم نے کون سی نظم کہی؟

۲۔ مخدوم نے کن ظالمانہ نظام کے خلاف عوام کو آواز عمل دی ہے؟

۳۔ نظم 'چاند تاروں کا بن' میں مخدوم نے ہندوستان کی اجتماعی زندگی کے کتنے اور کون کون سے ادوار پیش کیے ہیں؟

4.6 اختر الایمان

4.6.1 اختر الایمان کی حیات اور ادبی خدمات

حیات :

اختر الایمان 12 نومبر 1915ء کو ایک چھوٹے سے قصبے قلع پتھر گڈھ نجیب آباد ضلع بجنور اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام فتح محمد اور والدہ کا نام سلیمن تھا۔ان کے والد حافظِ قرآن تھے۔عربی، فارسی اور ہندی میں دسترس رکھتے تھے اور ساتھ ہی انھوں نے طب کی بھی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔امامت کا پیشہ اختیار کیا۔کہیں مستقل قیام نہیں کیا۔ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کوچ کیا کرتے تھے۔جس کی وجہ سے پورے خاندان کو خانہ بدوشوں کی سی زندگی گزارنا پڑتی تھی۔ان کی والدہ ایک سادہ لوح اور گھریلو خاتون تھیں۔اختر الایمان کے تین بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ان کے دادا کا نام اقبال راؤ تھا۔اختر الایمان کے بزرگ کا تعلق راجپوت قبیلے سے تھا۔

ابتدا میں اختر الایمان کو کمباسی اور اس کے بعد سگھ مدرسہ میں داخل کرایا گیا جو ایک یتیم خانہ تھا۔ان کے چچا ان کے والدین سے بہتر پرورش کا تیقن دلا کر انھیں اپنے ہمراہ دہلی لے گئے اور انھیں وہاں یتیم خانہ موید الاسلام میں داخل کرا دیا۔یتیم خانہ سے منسلک ایک اسکول بھی تھا۔یہاں کے اساتذہ عبدالصمد اور عبدالواحد نے ان کی ذہنی تربیت میں اہم رول ادا کیا۔دونوں اختر الایمان کی تحریری و تقریری صلاحیتوں کی ستائش اور ہمت افزائی کیا کرتے تھے۔اردو کے مشہور ادیب خورشید الاسلام بھی اس یتیم خانے میں اختر الایمان کے ساتھیوں میں تھے۔یہاں انھوں نے 1930ء سے 1934ء تک کا عرصہ گزارا اور آٹھویں جماعت پاس کر کے وہاں سے نکلے اور 1938ء میں فتح پور مسلم ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔یہاں بھی ایک استاد محمد غوث نے ان کی صلاحیتوں کو پہچانا اور انہیں اسکول میگزین کا مدیر بنا دیا۔

اختر الایمان نے اپنے شعری سفر کا آغاز غزل سے کیا لیکن جلد ہی نظم گوئی کی طرف مائل ہوئے طالب علمی ہی کے زمانے میں نظم ''گورِ غریباں'' لکھی جو اسکول میگزین میں شائع ہوئی اور اس کی خوب پذیرائی بھی ہوئی۔اسکول کی تعلیم

مکمل کر کے اختر الایمان نے اینگلو عربک کالج دلّی میں داخلہ لیا اور غیر تدریسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے ہوئے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جوائنٹ سکریٹری بن گئے ۔دوسری جانب ان سرگرمیوں کا خمیازہ بھی اٹھانا پڑا ۔اختر الایمان یہیں سے ایم ۔اے بھی کرنا چاہتے تھے لیکن پرنسپل نے انھیں داخلہ نہیں دیا۔اسی زمانے میں ساغر نظامی کی دعوت پر 1941ء میں ''ایشیا'' کی ادارت کی ذمہ داری قبول کی اور میرٹھ چلے گئے۔میرٹھ یونیورسٹی میں ایم ۔اے فارسی میں داخلہ لیا لیکن کچھ ہی دنوں بعد دہلی واپس آ گئے۔دہلی میں کچھ عرصہ سپلائی ڈپارٹمینٹ میں ملازمت کی اور پھر دہلی ریڈیو اسٹیشن میں ملازمت مل گئی لیکن جلد ہی یہ نوکری بھی ہاتھ سے چلی گئی۔علی گڈھ میں ایم ۔اے اردو میں داخلہ لیا وہاں رشید احمد صدیقی اور شاہد احمد دہلوی نے سرپرستی کی ۔پہلے سال امتیازی کامیابی حاصل کی لیکن معاشی مشکلات کے پیشِ نظر تعلیمی سلسلہ ترک کر دیا۔

1944ء میں اختر الایمان کی زندگی میں ایک اہم موڑ آیا۔انھوں نے حیدرآباد اردو کانفرس میں شرکت کی اور حیدرآباد سے پونا روانہ ہوئے۔اس دوران ان کا شعری مجموعہ ''گرداب'' شائع ہو چکا تھا اور وہ ادبی حلقوں میں معروف ہو چکے تھے۔پونے کے شالیمار اسٹوڈیو میں اختر الایمان ڈبلیو زیڈ سے ملے اور انھوں نے ہی اختر الایمان کو فلموں کے لیے کہانیاں لکھنے کا مشورہ دیا اور اس طرح اختر الایمان فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔

اختر الایمان کی پہلی شادی 1939ء میں والدہ کے دباؤ میں ایک دیہاتی لڑکی سے ہوئی اور یہ شادی بہت دنوں تک نہیں چلی اور ان کا طلاق ہو گیا۔3 مئی 1947ء کے ہنگامی دور میں ان کی دوسری شادی سلطانہ منصور سے ہوئی۔ ابھی رخصتی بھی نہیں ہوئی تھی کہ تقسیمِ ہند کے بعد سلطانہ کے افرادِ خاندان پاکستان ہجرت کر گئے اور سلطانہ ممبئی اختر الایمان کے پاس آ گئیں۔سلطانہ ایمان سے اختر الایمان کی تین لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔

ممبئی میں فلمی دنیا سے وابستگی کے زمانے میں اختر الایمان زندگی کی تگ ودو سے جوجھتے رہے، کبھی اپنی طبیعت کی بے نیازی کے سبب تو کبھی دوسروں کی ریاکاری کی وجہ سے انھیں اکثر معاشی مشکلات درپیش رہیں۔انھوں نے ممبئی میں اپنے 50 سالہ قیام کے دوران تقریباً 100 فلموں کے لیے منظرنامے (Screen play) اور مکالمے (Dialogues) لکھے۔جن میں مغلِ اعظم، وقت، قانون، نغمہ، رفتار، زندگی اور طوفان، آدمی، مجرم، شبنم، ضمیر، آدمی اور انسان اور اپرادھ جیسی بے حد مشہور فلمیں شامل ہیں۔

اختر الایمان نے مختلف مما لک کی سیر کی۔مشاعروں، سیمناروں اور فلمبندی کی غرض سے ملک اور بیرون ملک کے اسفار کیے۔اختر الایمان کی زندگی خوشحال گزر رہی تھی کہ اچانک جنوری 1986ء میں انھیں دل کی شکایت شروع ہوئی اور ممبئی میں برج کینڈی ہاسپٹل میں زیرِ علاج رہے۔ڈاکٹروں نے بوسٹن لے جانے کا مشورہ دیا اور اپریل 1986ء کو بوسٹن

روانہ ہوئے اور وہاں ان کے پانچ بائی پاس ہوئے اور ایک valve بدلا گیا۔صحت یاب ہوکر ممبئی واپس آئے اور بہت ساری مصروفیتیں صحت کے چلتے ترک کردیں لیکن صحت دن بہ دن بگڑتی ہی رہی اور 9 مارچ 1996ء کو انتقال ہوا اور باندرہ قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ان کے مزار کے کتبے پر ان ہی کے یہ دو مصرعے کندہ ہیں۔

اس مسافت میں رَہ رَہ کے لپٹی تھی جو
میں نے وہ خاک بھی پاؤں سے جھاڑ دی

اخترالایمان کو ان کی شعری خدمات پر کئی ایک اعلیٰ اور پُر وقار انعامات واعزازات سے نوازا گیا ہے۔ان کے شعری مجموعے ''یادیں'' کو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔''بنتِ لمحات'' کو اتّر پردیش اردو اکیڈمی اور میرا کیڈمی نے انعامات سے نوازا۔''نیا آہنگ'' پر مہاراشٹر اردو اکیڈمی کا انعام ملا اور ''سروسامان'' پر مدھیہ پردیش حکومت نے اقبال سمان سے نوازا۔اسی مجموعے کو غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی اور اردو اکیڈمی دہلی نے بھی انعامات عطا کئے۔

ادبی خدمات :

اخترالایمان کو شمس الرحمن فاروقی نے اپنے ایک مضمون میں جدید شاعری کا باوا آدم قرار دیا ہے۔انھوں نے اپنے طرز کی شاعری کی نہ کسی تحریک سے وابستہ ہوئے اور نہ کسی رجحان سے متاثر ہوئے اور نہ ہی فلمی گیتوں کے لیے اپنی شاعری کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کیا۔اخترالایمان نے فلموں کے لیے منظرنامے اور مکالمے تو ضرور لکھے لیکن گیت نہیں لکھے۔انھوں اپنی خودنوشت ''اس آباد خرابے میں'' کے عنوان سے لکھی۔

اخترالایمان کے دس(۱۰) شعری مجموعے ہیں۔جن میں نو(۹) ان کی زندگی میں اور ایک ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔

۱) گرداب 1943ء
۲) سب رنگ 1946ء
۳) تاریک سیارہ 1952ء
۴) آبِ جُو 1959ء
۵) یادیں 1960ء
۶) بنتِ لمحات 1969ء
۷) نیا آہنگ 1977ء

۸) سروسامان 1983ء

۹) زمین زمین 1990ء

۱۰) زمستانِ سرد مہری 1997ء

۱۱) اس آباد خرابے میں (خودنوشت سوانح عمری)

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ اختر الایمان کی ولادت کب ہوئی۔

۲۔ اختر الایمان کی خودنوشت سوانح عمری کا نام کیا ہے۔

۳۔ اختر الایمان کے شعری مجموعے کتنے ہیں۔

۴۔ اختر الایمان کے کونسے شعری مجموعے کو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملا۔

4.6.2 اختر الایمان کی نظم نگاری

اختر الایمان اردو نظم نگاری کی روایت میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے نظم کی ہیئت میں کامیاب تجربے کیے اور اردو نظم کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ جس کی بنا پر شمس الرحمن فاروقی نے انھیں ہندوستان میں نئی شاعری کا باوا آدم قرار دیا ہے۔ اختر الایمان نے اردو کی شعری روایت کی کہیں پاسداری کی ہے تو کہیں اس سے انحراف بھی کیا۔ ترقی پسند تحریک نے تقریباً تمام قلمکاروں کو متاثر کیا اور بہت سے قلم کاروں کے یہاں موضوعات کی تکرار نظر آتی ہے۔ لیکن اختر الایمان نے اپنی فکر وفن کی الگ راہ نکالی۔

اختر الایمان نے ۱۷۔۱۶ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ فتح پور مسلم ہائی اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں ہی انھیں اسکول میگزین کا مدیر بنا دیا گیا اور اسی رسالے میں ان کی نظم ''گورِ غریباں'' شائع ہوئی جس کی بہت پذیرائی ہوئی۔ وہ ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق دونوں سے وابستہ رہے لیکن اس وابستگی کا اثر ان کی شاعری میں دکھائی نہیں دیتا۔ وہ نظم کی ہیئت یا موضوع کے انتخاب میں کسی خارجی نظریے کی پابندی یا اصول کے قائل نہیں تھے۔ وہ شاعری کو مذہب کا درجہ دیتے تھے۔

اختر الایمان کی نظم نگاری کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔ ڈرامائیت، خودکلامی، مکالماتی انداز، علامتوں کا استعمال، محاکات نگاری، پیکر تراشی، روزمرہ زبان کا تخلیقی استعمال وغیرہ۔ اختر الایمان کی شاعری میں ڈرامائیت، شعری زبان اور

آہنگ سے عبارت ہے۔ڈراما کے مکالمے کی طرح ان کی نظموں کے مصرعوں کو بھی بولا جا سکتا ہے۔اور خصوصاً ان کے یہاں ڈرامائی یک کلامی (Dramatic Monologue) کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔نظم ''ایک لڑکا'' سے مثال دیکھیے۔

یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلاّ کے کہتا ہوں
وہ آشفتہ مزاج ،اندوہ پرور ،اضطراب آسا
جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مر چکا ظالم
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اس کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں
میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مر چکا جس نے
کبھی چاہا تھا اک خا شاکِ عالم پھونک ڈالے گا
یہ لڑکا مسکراتا ہے ، یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب وافترا ہے،جھوٹ ہے،دیکھو میں زندہ ہوں

اخترالایمان نے اپنی شاعری میں علامتوں کو بخوبی استعمال کیا ہے۔علامتی انداز کی نظموں میں موت ،مسجد ، پرانی فصیل ،تنہائی میں اور ایک لڑکا قابلِ ذکر ہیں ۔مسجد اور پرانی فصیل عقائد اور اقدار کی شکست وریخت کی علامتیں ہیں ۔موت اور تنہائی میں وقت کی بے رحمی اور انسان کی ازلی اور ابدی تنہائی کو علامتی پیرائے میں پیش کیا ہے اور نظم ایک لڑکا میں ایک لڑکا انسانی ضمیر کی علامت ہے ۔اخترالایمان علامتوں کے ساتھ ڈرامائی طرزِ اظہار سے نظموں میں دلکشی پیدا کرتے ہیں اور یہی انداز ان کی نظموں میں فنی اور معنوی سطحوں پر ان کی تخلیقی صلاحیتوں اور شاعرانہ اظہار کی انفرادیت کا بین ثبوت ہے۔نظم مسجد کا ایک بند ملاحظہ ہو:

حسرت شام وسحر بیٹھ کر گنبد کے قریب
ان پریشان دعاؤں کو سنا کرتی ہے
جو ترستی ہی رہی رنگِ اثر کی خاطر
اور ٹوٹا ہوا دل تھام لیا کرتی ہے

اس بند میں حسرت علامت ہے مذہب کے احیا کی، مسجد ویران ہوگئی ہے اس مذہب کے پیروؤں کی اپنے مذہب سے دوری کے سبب مسجد نمازیوں سے خالی ہے اور اس کے رکھ رکھاؤ اور صفائی کا بھی انتظام نہیں ہے۔ مذہبی احیا پسند آنکھیں اسے آباد دیکھنا چاہتی ہیں اور دعاؤں کا رنگِ اثر دیکھنے کی منتظر ہیں۔ اس نوع کی نظموں میں مفاہمت، شیشہ کا آدمی، کل کی بات، بزدل، نیند کی پریاں، یادیں، اپاہج گاڑی، باز آمد، ایک منتاج، کالے سفید پروں والا پرندہ اور میری ایک شام وغیرہ شامل ہیں۔

اختر الایمان کی شاعری میں وقت کو مرکزیت حاصل ہے۔ وقت کی ناگزیریت کے فلسفے کو انھوں نے مختلف علامتوں کے ذریعہ شعری پیکروں میں ڈھالا ہے۔ ان نظموں میں کہیں وقت کی جبریت کو موضوع بنایا ہے تو کہیں قوتِ شفا کو، وقت انسانوں پر ظلم ڈھاتا ہے جس کے نتیجے میں کبھی فراق تو کبھی ابدی جدائی نصیب بن جاتی ہے۔ لیکن وقت ہی جدائی کے درد کو قابلِ برداشت بھی بنا دیتا ہے اور بڑے سے بڑے زخموں کو وقت ہی مندمل کر دیتا ہے۔ ان کی نظم سحر کے اس بند سے ان کے فلسفہ وقت کو سمجھا جاسکتا ہے۔

کون سی راحتِ دوراں جو میسر آئی
داغ دے کر نہ گئی، کون سے لمحات نشاط
ٹیس بن کر نہ اٹھے زہر نہ چھوڑا مجھ میں
ہر نیا واقعہ اک حادثہ تھا، ہر نئی بات
خال بد نکلی، کیا زخم دروں کو گہرا
پھر بھی وہ کون سا جادو ہے جو ہر تازہ وفات
یوں بھلا دیتا ہے جی کہ نشاں بھی نہ ملیں

(سحر)

اختر الایمان اپنی نظموں میں بے حد خوبصورت لفظی پیکر تراشتے ہیں، وہ مناظرِ فطرت ہی کی نہیں بلکہ جذبات واحساسات کی دلکش تصویریں پیش کرتے ہیں جو قاری کے ذہن کے پردۂ سیمیں پر چلنے والی ریل کی طرح ایک کے بعد ایک بدلتی رہتی ہیں۔ اختر الایمان نے فلموں کے لیے منظرنامے اور مکالمے لکھے اور اس فن کے ماہرین میں شمار کیے جاتے ہیں یہی فنی صلاحیتیں شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کے جادو سے فطری پیکر حسیاتی پیکر میں بدل جاتا ہے۔ نظم ''عہد وفا'' کا یہ بند دیکھئے۔

یہی شاخ تم جس کے نیچے کسی کے لیے چشم نم ہو' یہاں اب سے کچھ سال پہلے
مجھے ایک چھوٹی سی بچی ملی تھی' جسے میں نے آغوش میں لے کے پوچھا تھا بیٹی
یہاں کیوں کھڑی رو رہی ہو' مجھے اپنے بوسیدہ آنچل میں پھولوں کے گہنے دکھا کر
وہ کہنے لگی میرا ساتھی ادھر' اس نے انگلی اٹھا کر بتایا' ادھر اس طرف ہی
جدھر اونچے محلوں کے گنبد' ملوں کی سیہ چمنیاں آسماں کی طرف سر اٹھائے کھڑی ہیں
یہ کہہ کر گیا ہے کہ میں سونے چاندی کے گہنے ترے واسطے لینے جاتا ہوں رامی!

اخترالایمان کی نظموں میں شہری اور دیہی زندگی کے فرق کو پیش کیا ہے۔ دیہی زندگی کی معصومیت اور شہری زندگی کی بےحسی اور بےتعلقی کو موضوع بنایا ہے۔ دوسری اصناف کے مقابلے نظم کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس میں کسی بھی موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس میں شاعر اپنے مافی الضمیر کے بیان میں کسی طرح کی رکاوٹ محسوس نہیں کرتا۔ اخترالایمان کی نظمیں اپنے پیش روؤں اور معاصرین دونوں سے مختلف ہیں کیونکہ ان کا اسلوب لب ولہجہ اور ڈکشن بھی منفرد ہے۔ اخترالایمان نے اپنے عہد کی زندگی میں انسانوں کے متضاد رویوں اور اخلاقی قدروں کی پامالی پر گہرا طنز کیا ہے۔ دراصل انہیں انسانی قدریں بہت عزیز ہیں اور جس دور میں انھوں نے لکھنا شروع کیا تھا وہ دور عالمی جنگوں، دہشت، تقسیمِ ہند اور فسادات کی خونریزی، بےضمیری، بےحسی، نفرت، مفاد پرستی نے انسان کو جکڑ لیا تھا۔ امن وعافیت، محبت ویگانگت، خلوص ودردمندی عنقا ہوتے جارہے تھے۔ اخترالایمان نے بہت مختصر نظمیں بھی لکھیں ہیں اور رمزیت، اشاریت اور علامتوں کے استعمال سے اختصار میں بھی فنی حسن اور معنویت پیدا کی ہے۔ اپنے منفرد اسلوب اور لب ولہجے کے سبب اردو شاعری میں خاص مقام ومرتبے کے حامل رہیں گے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ اخترالایمان کی علامتی انداز کی نظموں کے نام لکھیے۔
۲۔ اسکول میگزین میں اخترالایمان کی کون سی نظم شائع ہوئی؟
۳۔ اخترالایمان کی شاعری میں کس کو مرکزیت حاصل ہے؟

4.7 خلاصہ

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درجِ ذیل باتیں سیکھیں۔

- فیض، مخدوم اور اختر الایمان اردو کے اہم شاعر ہیں۔
- فیض، مخدوم اور اختر الایمان نظم نگار شاعر ہیں۔
- فیض اور مخدوم کا تعلق ترقی پسند تحریک سے ہے۔
- ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے سبب مارکس ازم کے اثرات کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔
- جنگ آزادی کی لڑائی میں مخدوم کی نظموں نے نعرہ کی شکل اختیار کرلی۔
- اختر الایمان باضابطہ طور پر ترقی پسند تحریک کے رکن نہیں تھے۔
- اختر الایمان نظم نگاری میں ایک منفرد اسلوب اپنایا جس کی بنا پر شمس الرحمٰن فاروقی نے انھیں جدید شاعری کا باوا آدام قرار دیا۔
- اختر الایمان فلمی دنیا سے وابستہ تھے۔ کئی مشہور فلموں جیسے مغل اعظم، پاکیزہ، وقت وغیرہ کے منظر نامے، مکالمے لکھے۔ ان کے مکالموں کو بے پناہ شہرت حاصل ہوئی۔
- فیض، مخدوم اور اختر الایمان نے اپنی شاعری کے ذریعے عوام میں سیاسی وسماجی شعور بیدار کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

4.8 نمونۂ امتحانی سوالات

(الف) درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

ا۔ فیض احمد فیض حالات زندگی پر ایک نوٹ لکھیے۔

۲۔ مخدوم کی عملی جدوجہد پر اظہار خیال کیجیے۔

۳۔ اختر الایمان کی تعلیمی زندگی پر روشنی ڈالیے؟

(الف) درج ذیل سوالات کے تفصیلی جوابات لکھیے۔

ا۔ فیض کی نظموں میں رومانیت اور انقلابیت پر گفتگو کیجیے۔

۲۔ مخدوم کی نظم نگاری کی فنی خوبیاں بیان کیجیے۔

۳۔ اختر الایمان کی نظم نگاری کی امتیازی خصوصیات بیان کیجیے۔

4.9 فرہنگ

عصری	زمانے سے نسبت رکھنے والی کوئی شئے
سامراج	نوآبادیات اور ماتحت سلطنتیں رکھنے کی پالیسی
قلیل	نہایت کم
علالت	بیماری
تابناک	روشن
آسودگی	چین، راحت
اعتماد	بھروسہ
صعوبتیں	تکلیفیں
متعصب	تعصب کرنے والا
مفاد پرست	مطلبی انسان
ہجرت کرنا	ایک مقام سے کوچ کر کے دوسرے مقام پر سکونت اختیار کرنا
ہیئت	ساخت، صورت وشکل
شکست	ہار
سحر	صبح
عنقا	غیر موجود
ملازمت	نوکری
جہد مسلسل	لگاتار کوشش کرنا
پاسداری	لحاظ کرنا، روایت کو آگے بڑھانا
انحراف	برخلاف، مخالفت
پذیرائی	قدردانی
ترک کرنا	چھوڑ دینا

4.10 معاون کتابیں

۱۔	نسخہ ہائے وفا	فیض احمد فیض
۲۔	فیض فہمی	تقی عابدی
۳۔	مخدوم شکست اور فن	شاذ تمکنت
۴۔	بساطِ رقص	مخدوم محی الدین
۵۔	اس آباد خرابے میں	اختر الایمان
۶۔	یادیں	اختر الایمان
۷۔	اختر الایمان مقام اور کلام (منتخب مضامین اور نمائندہ نظمیں)	فیروز احمد

☆☆☆

اکائی۔ 5 : ن۔م۔راشدؔ،سکندرعلی وجدؔ،ساحرؔلدھیانوی

ساخت :

5.1 اغراض ومقاصد

5.2 تمہید

5.3 ن۔م۔راشد،سکندرعلی وجداورساحرؔلدھیانوی کا عہد

5.4 ن۔م۔راشد

5.4.1 ن۔م ۔راشد کی حیات وشخصیت

5.4.2 ن۔م۔راشد کی نظم نگاری

5.5 سکندرعلی وجدؔ

5.5.1 سکندرعلی وجدؔ کی حیات وشخصیت

5.4.2 سکندرعلی وجدؔ کی نظم نگاری

5.6 ساحرؔلدھیانوی

5.6.1 ساحرؔلدھیانوی کی حیات وشخصیت

5.6.2 ساحرؔلدھیانوی کی نظم نگاری

5.7 خلاصہ

5.8 نمونۂ امتحانی سوالات

5.9 فرہنگ

5.10 معاون کتابیں

5.1 اغراض ومقاصد

ساحرؔ، وجدؔ اور ن۔م راشد نے اپنے فن کے ذریعے زندگی کی حقائق کی ترجمانی کی تاکہ لوگ حقیقتوں کا سامنا کرسکیں۔ یا یوں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ زندگی کے خدوخال پیش کرنے میں یہ شعراء کامیاب رہے۔انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے زمانے کی صحیح تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔انؔ کا کلام غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا حسین سنگم ہے۔اُن کی حیات اور خدمات کا مطالعہ بے حد ضروری ہے تاکہ طلبا اُن کے کلام کی چند نمونوں کی مدد سے اس دور کے حقائق کو سمجھ سکیں۔

5.2 تمہید

ہندوستان میں زندگی کے بدلتے طرزِ عمل نے ادب کو بدلنے پر مجبور کیا۔آزاد نظم کی نئی ترکیب کافی حد تک کامیاب نظر آئی۔خیال وفکر کے نئے سانچے میں ادب پیش کیا گیا جو ہر خاص وعام میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ن۔م۔راشدؔ کے کلام میں حالات حاضرہ کا بھرپور عکس ملتا ہے۔اُن کے فنی وذہنی افکار کارفرما نظر آتے ہیں۔واقعی آپ کی شاعری نے اُس دور کا حق ادا کیا اور عوام الناس کے مسائل کو ادب میں جگہ دی جس سے قاری ادب سے اور قریب ہوتا گیا۔

وجدؔ نے غزلوں میں حُسن عشق اور دلی کیفیات کو موثر طریقے سے پیش کیا۔لیکن یہ دور اردو نظم نگاری کے نظر سے دیکھا جائے تو کامیاب دور کہلاتا ہے۔لہٰذا وجدؔ کے دور میں اطراف واکناف کا حول،مزاج اور انداز قدر مختلف تھا۔ صدیوں پُرانے سماجی،سیاسی اور معاشی اونچ،نیچ کو ختم کر کے ایک نئے نظام کی بات عام تھی۔

ساحرؔ لدھیانوی نے جب شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو فیض کی انقلابی شاعری بامِ عروج پر تھی۔لہٰذا شاعری دلی جذبات کے اظہار کے ساتھ اُس دور کے حالات کا تقاضا بھی کررہی تھی۔ترقی پسند تحریک کے قدم ہندوستان کی سرزمین پر پوری طرح جمنے لگے۔بڑی تعداد میں شعراء اس تحریک سے متاثر ہورہے تھے۔احتجاجی وانقلاب کی آواز زوروشور سے سنائی دے رہی تھی۔فضا میں تبدیلیوں کی آہٹیں سنائی دے رہی تھی۔روایتی اردو شاعری کا انداز یکسر بدل رہا تھا۔ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زندگی کا فلسفہ بڑے ہی آب وتاب کے ساتھ سنایا جارہا تھا۔

ادب میں ہندوستان میں طبقوں اور گرہوں میں بٹے لوگوں کی زندگیوں کے حالات اور محنت کش طبقے کے مسائل صدیوں پرانی ظلم وستم کی روایت پر سخت چوٹ کرتے ہوئے انسان دوستی،حب الوطنی اور امن وامان پر زور دیا گیا۔ترقی کے لیے سماج میں انصاف اور امن ہو،یہی کچھ ان شعراء کا خاص پیغام تھا۔

5.3 ن ۔م ۔راشدؔ،سکندرعلی وجدؔاور ساحرؔلدھیانوی کا عہد

ساحرؔلدھیانوی ،سکندرعلی وجدؔ ،اورن ۔م ۔راشدؔ کادورکم وبیش ایک ہی ہے۔یعنی آزادی سے قبل شاعری کا آغاز کیا۔تحریک آزادی کے مسائل ،انسانی زندگی ،حالات ،ظلم وجبر تشدد،جنگیں،آزادیٔ وطن،تقسیم ہند،ایک نئے ملک کاوجود،ہجرت کے مسائل،ترقی پسند دوراور جدیدیت کے دور کے حالات ،واقعات سب کچھ اس دور میں تیزی سے بدل رہے تھے۔انقلابوں،تحریکوں،تبدیلیوں سے انسانی زندگی دوچار تھی ۔ایک نئے سورج کے طلوع ہونے کی تمنا تھی ۔مغربی علوم خاص کرانگریزی ادب سے ہندوستانی زبان وادب میں ایک صحت مند سوچ پیدا ہوئے جو بدلتے دور کا تاثر پیش کررہی تھی ۔تقسیم ہند سے ہجرت کے مسائل بڑے پیمانے پر دکھائی دیئے۔جدید سوچ وفکر کے ساتھ انسانی زندگی کودیکھنے کی تڑپ دکھائی دے رہی تھی ۔زندگی کے ہر شعبے اور ہر حصے میں سائنٹفک سوچ اور جدید نظریہ نظر آنے لگا۔ پہلے کے مقابلے اب دنیا چھوٹی نظر آنے لگی ۔ادب میں صحت مند تبدیلیوں کا آغاز تو بہت پہلے ہی ہو گیا تھا۔حیات اور کائنات کے مسائل،تقاضوں اورضرورتوں کو پیش کرنے کا ادب تخلیق ہورہا تھا۔یہی ساحرؔ،سکندرعلی وجدؔاورن ۔م راشدؔ کا دورتھا جس میں ادب میں صحت مند تبدیلیاں ہورہی تھیں ۔ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زندگی کا نظریہ عام تھا۔عوام کی سوچ وفکر میں خاصی تبدیلیاں دیکھی گئی ۔عوامی سوچ ،نظریہ،جذبات ،احساسات کی عکاسی مناسب طور پر ہونے لگی ۔رفتہ رفتہ زندگیوں میں تبدیلیاں نظر آرہی تھی ۔باقاعدہ نظموں اورغزلوں اورآزادنظموں کا چلن عام ہورہا تھا ۔اسلوب،انداز،موضوعات میں نمایاں فرق دکھائی دے رہا تھا،شاعر کا ذہین علاقائی حدود سے نکل کر عالمی سوچ وفکر کے دائرے میں داخل ہوچکا تھا۔

5.4 ن ۔م ۔راشدؔ

5.4.1 ن ۔م ۔راشدؔ کی حیات اور شخصیت

نذر محمد راشد جو آگے چل کر ن ۔م ۔راشد کے نام سے مشہور ہوئے ۔گجرانوالہ ضلع کے ایک قصبے اکال گڑھ میں 1910ء میں پیدا ہوئے جوکہ اب پاکستان کا حصہ ہے۔ابتدائی تعلیم اکال گڑھ اوراعلیٰ تعلیم گورنمنٹ کالج لاہور سے حاصل کی ۔اردواورفارسی کی تعلیم سے آراستہ ہوئے گھر کا ماحول علمی وادبی تھالہٰذااس کا گہرا اثر ن ۔م راشد کی شخصیت پر کافی گہرا ہوااوریہیں سے اُن کا علمی وفکری سفر کا آغاز ہوا۔جوآگے چل کراُن کی شخصیت کے مختلف پہلومنظر عام پر آئے ۔ دوران تعلیم آپ ''راوی'' کی ادارت بھی کی ۔بعد میں تاجور نجیب آبادی کے رسالے شاہکار کی بھی ادارت کی

،ملتان کے کمشنر آفس میں سرکاری ملازم بھی رہے۔ اُسی دوران آپ نے اپنی پہلی آزاد نظم، جرأتِ پرواز، لکھی جو اُن کے پہلے مجموعے ''ماوراء'' میں شامل ہے۔ضمناً پاکستان کے ایک بڑے اشاعتی ادارے کا نام آپ کے مجموعے کے نام سے متاثر ہو کر رکھا گیا۔

1939ء میں راشد آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے اور بعد میں ترقی کرتے ہوئے وہاں کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ تقسیم کے بعد آپ پاکستان ریڈیو کے ریجنل ڈائریکٹر کے عہدے پر کام کئے۔ پاکستان کی جانب سے آپ کو اقوام متحدہ کے صدر دفتر نیویارک میں خدمات انجام دینے کیلئے مامور کیا گیا۔ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے انگلستان میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔9/ اکتوبر 1975ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

ن۔م۔راشد نہایت ہی ذہین تھے۔شاعری کا لگاؤ بچپن سے تھا۔ردیف قافیہ کی پابندیوں سے ہٹ کر جو آپ نے شاعری کی وہ انہیں کی خاصہ بن گئی۔ادب میں اُن سے پہلے اور بعد ایسی شاعری شاذ و نادر ہی ملے گی۔جدید اردو نظم پر راشد کا بڑا احسان ہے۔الگ سوچ اور الگ انداز موضوع کے انتخاب سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔اُن کے کلام کے مجموعے ''ماورا''،''ایران میں''،''اجنبی''،''لا۔انسان'' اور ''گمان کا ممکن'' ہیں۔

غرض کہ راشد کی شخصیت کے پرتو اُن کی شاعری کی نمائندگی کرتے ہیں۔اُن کی فطرت میں ایک نیا پن ایک نئی سوچ تھی جو اردو نظم خاص کر آزاد نظم کو بلندیوں پر پہنچا دی۔بقیہ لوگ آج تک صرف اُن بلندیوں کا نظارہ کر رہے ہیں۔ اردو فارسی عربی کے علاوہ یوروپی زبان وادب کا مطالعہ تھا جس کی وجہ سے خیال وفکر کے اعتبار سے نیا پن جدت پسندی ،روایات، تحقیق، تنقید، تبصرہ، ترجمہ، موازنہ وغیرہ سے آپ اچھی طرح واقف تھے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ ن۔م راشد کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

۲۔ ن۔م۔راشد کی شخصیت کے نمایاں پہلو بیان کیجئے؟

5.4.2 ن۔م۔راشد کی نظم نگاری

جدید اردو نظم کے بانی بلاشبہ مولانا حالی اور محمد حسین آزاد ہیں۔لیکن جو داغ بیل آپ نے ڈالی تھی وہ اس راہ پر نظم قائم نہیں رہی آگے چل کر جو بڑی تبدیلیاں نظم میں رونما ہوئی اُس کی بنیادی کوششیں۔ن۔م۔راشد کی تھی۔آپ نے نہ صرف آزاد نظم کو رواج دیا بلکہ اظہار کے نئے تجربوں کو اپنا کر خوشنما تبدیلیوں کو پیش کیا جس سے جدید شعراء متاثر ہوئے

بغیر نہ رہ سکے ساتھ ہی باشعور سامعین کو بھی متوجہ کیا۔

شاعری راشد کے خون میں تھی ۔وراثت میں پائی ہوئی چیزیں راشد کوشاعری کی جانب مائل کی ۔باپ دادا شاعر تھے۔ باپ نے خاص کراُن کی علمی وشعری ذوق کوحوصلہ دیا۔جدیداردونظم پرسب سے بڑااحساس اگرکسی نے کیا ہےتو وہ راشد صاحب ہیں۔انہوں نے جدید نظم کو نیا رنگ وآہنگ عطا کیا۔اُن کی نظمیں فکری اورفنی اعتبار سے لاجواب ہیں۔جونہایت ہی غور وفکر کا مطالبہ کرتی ہیں۔ اُن کی نظمیں فکر وفن کے سورماؤں کوبھی سوچنے پر مجبور کردیتی ہیں۔ دانشوروں کے ذہین بھی متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔انہوں نے جدید نظم میں تہہ داری پیدا کی۔نظم کا عنوان بڑاجاذب اورتوجہ کا طالب ہوتا ہے۔بعض قارئین کواُن کی نظموں سے ابہام کی شکایت بھی رہی۔

ماورا،ایران میں،اجنبی،لا=انسان اورگمان کاممکن انکے شعری مجموعے ہیں۔اجنبی عورت،نمرود کی خدائی،حیلہ ساز،داشتہ،اتفاقات،دریچے کےقریب،انتقام،رقص اُن کی شاہکار نظمیں ہیں۔جوادب میں نئی اوراعلیٰ سوچ کے نمونے کےطور پرنظر آتی ہیں۔

ن۔م۔راشدایسے شاعر ہیں جنہوں نے اپنے دور کی ترجمانی کرتے ہوئے نوجوان نسل میں نیا شعور واحساس جگایا۔راشد صاحب کے نزدیک شاعری کا مطلب یہ ہے:

''اس دور میں شعر کی دنیا کچھ ایسی بدلی ہے کہ خود مجھے اپنی شاعری کی شہر مدفون
سے نکلے ہوئے آثارقدیمہ کی طرح قیمتی معلوم ہونے لگی''

راشد نے روایت سے بغاوت کرتے ہوئے ایک طرزفکراور نیا طرز عمل اپنایا جونئی نسل کواپنی جانب راغب کرلیتا ہے۔اُن کی سوچ کا دائرہ بہت وسیع ہےاوروہ قاری کی سوچ کوبھی وسیع کردیتے ہیں جواُن کےفن کی معراج ہے۔اس ضمن میں اُن کا غنائی شاعری کا رنگ بڑے شعراء سے میل ضروررکھا تا ہےلیکن فکروفن کےاعتبار سے راشد صاحب دوسروں سے مختلف ہیں۔

وہ شاعری میں تنوع اور لچک پیدا کردیتے ہیں۔اُ نکی شاعری سے متاثر ہونے کیلئے ایک ایک اعلیٰ درجہ بدذہین کی ضرورت ہے۔اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ ایک عام نہیں بلکہ خاص شاعر ہیں۔حاکم ومحکوم کے معاملات کوبڑی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کرتے ہیں،زمانے کے بدلتے انداز،انسانی سوچ اوراحساس آگہی کوبڑی موثر طریقے سے اپنے الفاظ کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔جوایک بڑے فنکار کےفن کی دلیل ہے۔

آپ کے چارشعری مجموعے ماورا1942،ایران میں اجنبی 1955لا۔انسان گمان کاممکن 1977 شائع ہوئے۔قیام ایران کے دوران انہوں نے 80 جدید فارسی شعراء کے کلام کا ترجمہ جدید فارسی شاعر کے نام سے مرتب کیا۔اُن کے مختلف ادبی مضامین جوشاہکار کا درجہ رکھتے ہیں کہ ادبی لحاظ سے وہ مضامین بڑے ہی انوکھے اورمعنی خیز

معلوم ہوتے ہیں۔ جومختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ راشدؔ صاحب کا براہ راست تعلق ترقی پسند تحریک سے نہیں رہا بلکہ حلقہ ارباب ذوق سے آپ کا تعلق تھا۔فیض احمد فیض نے نقش فریادی کا دیباچہ راشدؔ سے ہی لکھوایا۔ راشد صاحب آزاد نظموں کو بڑی چابکدستی کے ساتھ پروان چڑھایا ہے وہ لاجواب ہے۔ آپ بعض جگہوں پر تراش خراش اور سلیقے وطریقے کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ داخلی ربط اور خارجی حسن کی وجہ سے اُن کی نظمیں شاہکار بن جاتی ہیں۔

ہئیت کے اعتبار سے راشد کے تجربے یقینا کامیاب رہے اور ہمیشہ اردو شاعری راشد کی زبان، بیان، اسلوب ،ترتیب وتدوین کے لئے یاد رکھے گی۔ اردو شاعری کو روایتی بندھنوں سے آزاد کر کے جدید اور بین الاقوامی سانچے میں ڈھالنے کا کام راشد نے کیا۔

سوچتا ہوں کہ بہت سادہ ومعصوم ہے وہ
میں ابھی اس کو شناسا نے محبت نہ کروں

سحر عشق میں اس کی اثر شام نہیں
زندگی اس کیلئے زہر بھرا جام نہیں

اپنے مطالعہ کی جانچ

ا۔ ن۔م۔راشدؔ کے کلام کی امتیازی خصوصیات بیان کیجئے؟

۲۔ ن۔م۔راشدؔ کی نظم گوئی پر اپنے تاثرات پیش کیجئے؟

5.5 سکندر علی وجدؔ

5.5.1 سکندر علی وجد کی حیات وشخصیت

سکندر علی نام وجد تخلص 1914ء اورنگ آباد مہاراشٹرا میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد سے بی اے کا امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ وجد بچپن سے بڑے ذہین اور محنتی تھے۔ آپ کو شعراء ادب سے بہت خاص لگاؤ تھا۔ سول پرویس امتحان میں کامیاب ہو کر سرکاری ملازمت حاصل کی کامیابیوں کے کئی مراحل طے کرتے ہوئے ڈسٹرکٹ سیشن جج کے ایک اعلیٰ عہدے پر پہنچے۔

1930 سے آپ نے شاعری کا آغاز کیا۔ابتداء میں کلاسیکی انداز اور موضوع پر لکھے لیکن وقت اور حالات نے زمانے کے تقاضوں پر لکھنے پر مجبور کیا۔39-1938 میں آپ عدالتی کام کی ٹریننگ کے سلسلے میں سیتا پور (یو پی) میں رہے۔ بعد ازاں اورنگ آباد میں اسپیشل آفیسر ڈیپارٹمنٹل اسکوائریز رہے۔ سادگی پسند انسان تھے۔حساس ذہن کے مالک اور شخصیت میں انسانی ہمدردی،غریبوں،مزدوروں، کسانوں، کمزور طبقے کے لئے دل ڈھڑکتا ہے۔اُن کی شاعری کا کینواس بہت وسیع تھا۔خود اپنے بارے میں لکھتے ہیں۔

''میں نے اظہارِ خیال کے لئے کلاسیکی اسلوب منتخب کیا اور فنِ شعر کے اصولوں کی پابندی کرنے کی بھی امکانی کوشش کی ہے۔شاعری میں نئے تجربے کرنے کی مجھے فرصت نہیں۔ میری شاعری، میری زندگی، انسان کی عظمت اور ترقی ہندوستان کی تاریخ وسیاست اور یہاں کے فنونِ لطیفہ سے طاقت اور حسن حاصل کرتی رہی ہے''۔

16 مئی 1983ء اورنگ آباد میں وفات پائی۔آپ بنیادی طور پر نازک خیال،شیریں مقال اور فکر وفن کے شاعر ہیں،لفظوں کی دنیا کے یقیناوہ ایک بادشاہ ہیں۔آپ انجمن ترقی اردو مہاراشٹرا کے صدر رہ چکے ہیں۔1970 میں ان کو ادبی خدمات کے صلے میں پدم شری ایوارڈ سے نوازا گیا۔اُن کے مجموعۂ کلام آفتاب تازہ، بیاض مریم ، اوراقِ مصور، جمال اجنتا، جلالِ ہمالہ اور ہوتر نگ ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ

ا۔ وجدؔ کب اور کہاں پیدا ہوئے۔

۲۔ وجدؔ نے شاعری کا آغاز کب کیا؟

۳۔ وجدؔ کو حکومت ہند نے کس ایوارڈ سے نوازا؟

5.5.2 سکندر علی وجدؔ کی نظم نگاری

جدید اردو شاعری میں قدیم اردو کی روایات کا فکری سرچشمہ سکندر علی وجد کی شاعری ہے۔قدیم صالح روایات کی پاسداری،احساس کے ساتھ فکر وفن ، بصارت وبصیرت ،سوز وگداز اور حقیقتوں کی جلوہ گری کا شاہکار ہے۔حسن وجمال کے ساتھ کمالِ فن کا جیتا جاگتا نمونہ بھی آپ کی شاعری ہے۔تغزل کا رنگ غالب ہے۔آپ کے ہاں شعور آہنگ کمال کا تھا یہی خصوصیت اُن کی نظموں میں نمایاں نظر آتی ہے۔ نادر تشبیہات اور خوبصورت انداز نے وجدؔ کو درجہ کمال کی سند عطا کی۔جذبات نگاری اور حقیقت بیانی نے وجدؔ کو درجہ کمال تک پہنچادیا۔جذبات نگاری اور حقیقت بیانی نے وجد

کو بڑے شعراء کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اُن کے اشعار کی نغمگی دلوں کو مسرور کر دیتی ہے۔ احساس اور جذبے نے وجدؔ کو فکر وفلسفے کی جانب متوجہ کیا۔

وجد نے غزلیں بھی کہیں جن کا موضوع حسن وعشق اور قلبی واردات ہیں۔ اصل میں وہ ایک نظم کے کامیاب شاعر ہیں۔ اُن کی شاعری فکر وفن کا نتیجہ ہے۔ شاعری سے متعلق خود لکھتے ہیں:

''ہر آرٹ کی طرح شاعری بھی شاعر سے پوری زندگی کا مطالبہ کرتی ہے۔ جو شاعر اس مطالبے کی تکمیل نہیں کرتا اس کی شاعری تشنہ رہ جاتی ہے''۔

رقاصہ، نیلی ناگن، آثار سحر، خانہ بدوش، معطر لمحے ان کی دلکش نظمیں ہیں۔ جو فنی اعتبار سے بڑی کامیاب اور معنی خیز ہیں۔ اُن کے اشعار کا رنگ دوسروں سے مختلف ہے۔ ادبی چاشنی کا یہ رنگ بڑا ہی خوبصورت اور معنی خیز ہے۔

اے موسم خوشگوار آہستہ گزر
اے عکسِ جمال یار آہستہ گزر
زندوں میں نہ ہو جائے قیامت برپا
اے قافلہ بہار آہستہ گزر

جانے والے کبھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے

سکندر علی وجد کی شاعری دلی جذبات، کیفیات کا برملا اظہار ہے۔ کلاسیکی رنگ میں شیریں کلام نے وجدؔ کو نمایاں مقام عطا کیا۔ وجدؔ کی کامیاب نظمیں وہی ہیں جن میں تصوریت اور نغمگی کی خصوصیات یکجا ہوگئی ہوں۔ اس سے پوری نظم جادوئی کیفیات سے بھرپور قاری کے دل وجاں میں ودیعت کر جاتی اور سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ایسی نظموں میں نغمے کی موت، جگنو، نقش ونگار، سارنگی، پھلواری، ایلورا۔ وجدؔ اپنے اشعار میں نغمگی اور موسیقی کے سر بھر دیتے ہیں جس سے آہنگ ولے کے خوبیوں سے بھرپور اُن شاعری معراجِ کمال کا درجہ پالیتی ہے۔

موضوع کے طور پر آپ رومانی شاعر ہیں۔ نفیس خیالات اور باریک بینی وجدؔ صاحب کے فکر وفن کا سرچشمہ ہے۔ وجدؔ ایک روشن خیال شاعر ہیں جن کی شاعری حیاتِ انسانی کی مکمل تصویر پیش کرتی ہے۔ طبقوں، گروہوں میں بٹے سماج کی مناسب عکاسی کرتے ہوئے سماج کی واجب تصویر پیش کرتے ہیں۔

وجدؔ نے حالات کے بدلتے رخ کو پہچان گئے تھے۔ ادب کو آپ نے کبھی ذلیل ورسوا ہونے نہیں دیا۔ زمانے

کی بے قدریوں کے باوجود ایک حساس ذہین کا شاعر زبان خیال، انداز واسلوب سے سماج وقوم کی مناسب ترجمانی کرتا رہا۔ وجدؔ نے سماجی واخلاقی موضوعات پر کھل کر لکھا بے باک لکھا۔ ادب کو کہیں کمزور ہونے نہیں دیا حالات سے سمجھوتا نہیں کیا ذہین وفکر کے خیال کو الفاظ کا جامہ پہنا کر شاعری کا روپ دیا۔ جو زمانے کا تقاضا تھا وقت کی ضرورت۔ وجدؔ نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بھر پور استعمال میں لایا اُردو شعر وادب کے میدان کو اپنے گراں قدر فن سے بھر دیا۔ وجد کا کلام بھرتی کا سامان نہیں، معنوی وفنی خوبیوں سے بھر پور ہے۔ عوامی زندگی، سماجی مسائل اخلاقی مسائل اور حالات حاضرہ کا بھر پور جائزہ پیش کیا۔

اپنے مطالعہ کی جانچ

۱۔ وجدؔ کی بہترین نظمیں آپ کی نظر میں کونسی ہیں؟

۲۔ وجدؔ کی نظمیہ شاعری پر اظہار خیال کیجئے؟

۳۔ وجدؔ کے ادبی خدمات کا احاطہ کیجئے؟

5.6 ساحرؔ لدھیانوی

5.6.1 ساحرؔ لدھیانوی کی حیات اور شخصیت

عبدالحئی نام، ساحرؔ تخلص 8/ مارچ 1921ء لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ فضل محمد والد اور والدہ سردار بیگم تھیں۔ ماں باپ میں کشیدگی کا راست اثر ساحرؔ کے ذہین وفکر پر پڑا۔ دونوں میں علیحدگی سے ساحرؔ کی پرورش ماں اور ماموں کی ساحرؔ نے اردو اور فارسی میں ابتدائی تعلیم مولانا فیاض ہریانوی سے سیکھی۔ خالسہ ہائی اسکول لدھیانہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ وہ بڑے ذہین اور محنتی تھے۔ 1937ء میں میٹرک کے امتحان کے بعد انہوں نے 1943ء میں لاہور پہنچے جہاں انہوں نے دیال سنگھ کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں اسٹوڈینٹس فڈریشن کے صدر بنے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد فوراً ملازمت شروع کردی۔ لاہور میں ''ادب لطیف'' اور ''سویرا'' کی ادرات کی اس کے بعد دہلی میں کچھ عرصے کے لئے ''شاہراہ'' کے مدیر ہوئے۔

تقسیم ملک سے ساحرؔ بہت پریشان ہوئے اور انہیں بہت مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس اثناء میں تلاش روزگار میں آپ ادھر اُدھر گھومتے رہے۔ اس طرح آپ بمبئی پہنچے اور فلمی دنیا سے جڑ گئے۔ ساحرؔ کے فلمی گیت بہت مقبول ہوئے اور خاص وعام کی زبان پر جاری وساری رہے۔ اس دوران بمبئی میں ہونے والی انجمن ترقی پسند مصنفین کے

جلسوں میں آپ برابر شریک رہتے اور اشترا کی نظریات سے کافی متاثر تھے اور اشترا کی نظام کا اچھا خاصہ مطالعہ بھی کیا تھا اور آخر تک آپ اُس نظام کے اصول ونظریات پر قائم رہے۔ساحؔر نے فلمی دنیا کو بہت متاثر کیا جو گیت آپ نے لکھے اُس میں ادبی چاشنی موجود تھی۔آپ نے اپنی نظموں اور غزلوں اور گیت کے ذریعے ادب کو ذرخیز کیا اور کہیں بھی آپ نے ادب کے میعار کو گرنے نہیں دیا۔''تلخیاں'' ابتدائی دور کا کلام تھا۔ایک طویل نظم پر چھائیاں 1955 میں شائع کی پھر ''آؤ کہ کوئی خواب بنیں'' گا تا جائے بنجارہ،اے شریف انسانوں،تاج محل آپ کے شاہکار ہیں۔ساحؔر حساس طبیعت کے مالک تھے خود پر ہوئے ظلم وزیادتیوں کو جو گھریلو تھے اُس کو بڑی فنکاری کے ساتھ پیش کیا۔جو اُن کے تجربات ومشاہدات کا ایک ادنیٰ نمونہ تھا۔

دنیا نے تجربات وحواث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

8/مارچ 2013ءکو اُن کی یوم پیدائش پر محکمۂ ڈاک نے ایک یادگار ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔۱۹۸۰ء میں دل کا دورہ پڑھنے سے ان کا انتقال ہوا۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ ساحؔر لدھیانوی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
۲۔ ساحؔر لدھیانوی کے نام کب ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا؟
۳۔ ساحؔر کے صحافتی خدمات پر اظہار خیال کیجئے؟

5.6.2 ساحؔر لدھیانوی کی نظم نگاری

ابتدائی تعلیم کے بعد ساحؔر اعلیٰ تعلیم کے وران ملازمت کی تلاش میں رہے۔آپ پہلے سے بڑے ذہین اور محنتی تھے۔اخبارات سے جڑ کر آپ کی علمی وادبی شخصیت کا نکھار ہوا۔آپ میں شاعری کا ذوق پہلے سے تھا،اشترا کی نظریات سے متاثر تھے۔جس وقت آپ نے اردو شاعری کے میدان میں قدم رکھا۔جب فیض کی نظم مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ۔ ہر خاص وعام کی زبان پر تھی۔اُن کا پہلا مجموعہ کلام تلخیاں کے نام سے شائع ہو کر ابھی شاعری کی ابتدائی

مراحل میں تھی نظموں میں ناپختہ پن بھی ظاہر ہوتا ہے۔اور زندگی کے حالات کا جابجا اظہار بھی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ملتا ہے۔یہ شعر دراصل یہی پیش کرتا ہے

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

ساحؔر کی سوچ منفرد اور لب ولہجہ خاصا الگ تھا۔ بدلتے ماحول اور نئی سوچ کی نمائندگی ساحؔر کا کلام تھا اُن کے مزاج میں شاعرانہ بے ساختگی اور تغزل کے عناصر شروع ہی سے ملتے ہیں اُن کے اشعار اُس دور کے نمائندہ تھے۔

میں اور تم سے ترک محبت کی آرزو
دیوانہ کر دیا ہے غمِ روزگار نے

تم میں ہمت ہو تو دنیا سے بغاوت کر دو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

اب اے دل تباہ ترا کیا خیال ہے
ہم تو چلے تھے کاکلِ گیتی سنوارنے

ہو کر خراب مے ترے غم تو بھلا دئے
لیکن غمِ حیات کا درمان نہ کر سکے

اپنی شاعری کے ذریعے نوجوانوں کے دلوں کو گرمانے اور فلموں کے لئے ادبی نغمے پیش کر کے نئی نسل کو متاثر کرنے سے ساحؔر کی الگ پہچان بنی ،ساحؔر کا اسلوب نہایت ہی خوبصورت اور جذبات واحساسات کو لفظوں کے ذریعے شاعرانہ روپ دیا وہ قابل تعریف ہے۔رومان اور حقیقت کا امتزاج ساحر کا کلام ہے آپ کا کلام حیاتِ انسانی کے مسائل کا برملا اظہار ہے، رومانی، انقلابی ،سیاسی نظمیں ساحر کو بڑے مقام پر پہنچاتی ہیں۔

ملک اور قوم کی حالت نے انہیں سرکشی اور بغاوت پر مجبور کیا 1944ء میں پہلا مجموعہ کلام تلخیاں شائع ہوا۔ساحؔر کا بچپن اور جوانی کے ایام بڑے مشکل و کٹھن تھے یہی کچھ اُن کا کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔شخصیت میں تلخ اور انداز میں تیکھا پن تھا۔ساحؔر نے فلمی دنیا کو اپنے خوبصورت اور دل کو چھو لینے والے گیت پیش کئے۔1964 اور 1977 میں آپ کو

بہترین گیت کار کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ساحر نے کسانوں،مزدووں کے لئے انقلابی شاعری کی تو نوجوانوں کے لئے رومانی ونفسیاتی شاعری کی ساحر کی نظمیہ شاعری اُن کے تخلیقی صلاحیتوں کا انمول خزانہ ہے۔ اُن کے ذاتی تجربات واحساسات کا نچوڑ اُن کی شاعری ہے۔1971ء میں انہیں پدم شری ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔1972 میں مہاراشٹرا حکومت نے انہیں ''جسٹس آف پیس'' ایوارڈ سے نوازا،1973ء میں انہیں آؤ کہ کوئی خواب بنیں کے لئے سویت لینڈ نہرو ایوارڈ سے نوازا گیا۔

پرچھائیاں ،گاتا جائے بنجارہ ،آؤ کہ کوئی خواب بنیں اُن کی مشہور نظمیں ہے۔نظم تاج محل سے آپ کو بہت شہرت ملی۔ساحؔر نے فلمی نغموں کو فضول اور بیکار نظریات سے آزاد کیا۔لفظوں کے مناسب رکھ رکھاؤ نے ساحر کو لا جواب شاعر بنادیا۔تلخیاں اور تنہائیاں میں ساحر نے اپنے فن کا لوہا منوالیا۔دھرتی کے آنسو ایک مجموعہ کلام ہے جس میں حالاتِ حاضرہ اور مزدوروں کسانوں اور محنت کش طبقے کے حالات کا عمومی جائزہ پیش کیا۔ساحؔر کے جذبات واحساسات غریبوں اور کمزور لوگوں کی آواز بن گئے۔کئی جگھوں پر ساحؔر پر فیضؔ کا نمایاں اثر دکھائی دیتا ہے۔

ساحؔر کا شمار ترقی پسند دور کے نامور شعراء میں ہوتا ہے۔ترقی پسند دور اردو شعر وادب میں تحریکوں وتبدیلیوں کا دور رہا ہے۔ زمانے کے بدلتے حالات ،سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف حق گوئی وبے باکی کا واضح نمونہ ساحؔر کی شاعری ہے۔اقوام عالم کا درد ، زندگی کے مسائل ، روایتی شاعری کے ساتھ جدید تقاضوں کا عکس ہمیں ساحؔر کے کلام میں ملتا ہے۔ساحؔر کا شمار ترقی پسند شعراء میں ہوتا ہے جن کے کلام میں زمانے کے حالات اور حادثات کا عکس ملتا ہے۔ یوں تو ساحؔر کی شاعری ہر خاص وعام،چھوٹے بڑے،امیر غریب سب کے لئے ہے۔لیکن اُن کے کلام کی وضاحت بے ساختگی اور شیرینی مخصوص طور پر نوجوان طبقے پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔اس لئے ساحؔر کا مزاج شاعرانہ ہے۔ بے ساختگی اور تغزل کے عناصر شروع ہی سے ملتے ہیں۔ وہ دور سیاسی سماجی بیداری کا دور تھا۔لوگ قدامت پرست اصولوں سے تنگ آچکے تھے۔ ہمارے شعراء شاعرانہ داستان گوئی کو چھوڑ کر ادب برائے زندگی کو فلسفے کو پیش کررہے تھے۔ دنیا سرمایہ دارانہ نظام سے اُکتا گئی تھی۔ایسے حالات میں عوام کی سوچ وفکر میں انسان کے بنیادی مسائل سب سے اہم تھے۔اسی طرح ساحؔر ایک حقیقت پسند شاعر تھے بیباکی اور حقیقت بیانی آپ کے کلام کا جوہر ہے۔ساحؔر نے جو بھی پیش کیا وہ حقیقت تھی کہیں بھی بے راہ روی وتصنع جیسی چیزوں کا سہارہ نہیں لیا۔

ساحؔر کا کلام انسانی اقدار وتہذیب کا گہوارہ ہے۔اکثر ساحؔر کی شاعری کے موضوعات انسان اور انسانیت رہے۔حیات اور کائنات کے مسائل کو آپ نے پیش کیا۔سادگی آپ کے کلام کی بڑی خوبی ہے جابہ جا تلخی بھی ملتی ہے۔ مگر یہ تلخی سماج کے اُن ٹھیکہ داروں سے ہے جو ہمارے سماج کو چاروں جانب سے کھوکھلا کررہے ہیں۔

آپ بڑے سنجیدہ انسان ہیں۔ سنجیدگی اور سادہ مزاجی نے ساحرؔ کو انسانی اقدار کی پامالی کے خلاف کھڑ کیا۔ آپ اُن مجبور و بے بس لوگوں کے حق میں ہیں۔ جو صدیوں سے ظلم و ستم، جبر و تشدد اور استحصال کا شکار ہوئے۔ چنانچہ اسی خیال کی وضاحت احمد راہی یوں کرتے ہیں۔

''ساحرؔ کی شاعری میں بے حد تلخی ہے۔ یہ تلخی اُسی سنگدل سماج اُس استحصال معاشرہ کے خلاف ہے جس نے اس کو باپ کی زندگی میں بھی یتیم بنائے رکھا۔''

ساحرؔ کا کلام شرافت و انسانیت اور ہمدردی اقوام کی داستان بیان کرتا ہے۔ جا بہ جا ترقی پسند خیالات کا اظہار ملتا ہے۔ اسی طرح ساحرؔ مجبور اور کمزور طبقوں کے مسائل کو بڑے آب و تاب کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح ترقی پسند خیالات کا اظہار انہوں نے اپنے فن کے ذریعے کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا زیادہ سے زیادہ بھلا ہو جو ترقی پسند تحریک کا سب سے اہم منشور ہے۔ اُس کی پیروی ساحرؔ کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ انسان اور انسانیت کا درد سب سے اہم ہے۔ جس کو زمانہ قدیم سے لوگ ترستے آرہے ہیں۔ اسی نقطۂ نظر کی وضاحت ساحرؔ نے اپنے کلام میں جا بہ جا کیا ہے۔ گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے جہاں کا درد ساحرؔ اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں۔ نظم میرے گیت کا یہ شعر ساحرؔ کے نظریے کی وضاحت کرتا ہے۔

مجھے انسانیت کا درد بھی بخشا ہے قدرت نے
میرا مقصد فقط شعلہ نوائی ہو نہیں سکتا

ساحرؔ نے جب لکھنا شروع کیا تو ہندوستان میں یا یوں کہا جائے ساری دنیا میں تحریکوں، انقلابوں کا دور دورا تھا۔ اردو ادب میں ایک ولولہ انگیز تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ اشتراکیت اور عوامی انقلابی لہر نے ملک اور سماج کی بدلتی تصویر کا اشارہ دے رہی تھی۔ ہر طرف آزادی مساوات، یکسانیت گویا حقوق انسانی پر کھل کر بحث ہو رہی تھی۔ اس طرح ساحرؔ مزدوروں کسانوں اور محنت کش طبقے کے حق میں نظر آتے ہیں۔ وہ دور بڑا کشمکش سے بھرا تھا۔ سماج طبقوں میں بٹا تھا۔ مزدور کسان، کمزور طبقے کے لوگوں کی زندگی دوبھر ہوگئی تھی۔ ساحرؔ کا کلام سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت میں اور کمزور طبقے کو متحد و منظم ہونے کا پیغام دے رہا تھا۔ جو استحصال عوام کا ہو رہا تھا اس کے خلاف ساحرؔ یوں آواز دیتے ہیں۔

جاگو اے مزدور کسانوں
اُٹھو اے مظلوم انسانوں
دھرتی کے ان داتا تم ہو
جگ کے پران دوھاتا تم ہو

حالات کتنے بھی بگڑ جائے ساحرؔ امید کا دامن نہیں چھوڑتے۔ساہوکاروں اور سماج کے ٹھیکداروں کے جبر وتشدد کے خاتمے کی پیش گوئی بھی کرتے رہیں۔ یہاں پر ساحرؔ کا تجربہ مشاہدہ ومجاہدہ کافی اہم ہے۔محنت کش طبقے کی بدحالی پر افسوس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ کمزور پچھڑے طبقوں پر ہورہے مظالم کہ خلاف ساحرؔ کا نظریہ بالکل واضح ہے کہ اس طرح پر امید ہیں کہ یہ حالات ایک نئے زمانے کا اشارہ دے رہے ہیں۔

سنسار کے سارے محنت کش کھیتوں سے ملوں سے نکلیں گے بے گھر بے نور ہے بس انسان تاریک ملوں سے نکلیں گے دنیا امن اور خوشحال کے پھولوں سے سجائی جائے گی۔مزدوروں کی زندگی کے المناک مناظر وہ اس طرح کھینچتے ہیں کہ انکھیں نم ہوجاتی ہیں۔غریب عوام کی زندگی جہنم بن گئی ہے۔اس کا ایک نقشہ اپنے الفاظ میں ساحرؔ نظم کسی کو اُداس دیکھ کر یوں پیش کرتے ہیں۔

یہ کارخانوں میں لوہے کا شوروغل جس میں
ہے دفن لاکھوں غریبوں کی روح کا نغمہ
یہ مال روڈ پہ کاروں کی ریل پہل کا شور
یہ پٹریوں پہ غریبوں کے زددرو بچے

مذکورہ اشعار کے موضوعات انسان اور انسانیت کے درد کا اقرار کرتے ہیں۔اس طرح نظم پرچھائیاں سے متعلق علی سردار جعفری لکھتے ہیں۔

’’اس کا موضوع اس عہد کا سب سے اہم سوال ہے جس کا جواب ساری انسانیت کو دینا ہے۔اور عالمی امن تحریک اس پر شاہد ہے کہ اس کا جواب ہر ملک ہر قوم پر نسل ہر طبقے ہر مکتب خیال کے آدمی نے ایک ہی طرح دیا ہے۔دنیا کی نصف سے زائد آبادی نے امن عالم کے محضر پر اپنی مہر ثبت کی ہے۔‘‘

ساحرؔ انسان اور انسانیت کے حامی ہیں۔ظلم وستم ،جبر وتشدد،خون خرابہ،انسانی حقوق کی پامالی وغیرہ کی مخالفت میں ساحرؔ پیش پیش ہیں۔ بلاتفریق مذہب وملت قوم ومسلک انسان تو انسان ہے اُس کا خون بہانہ کہاں کا انصاف ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات کا مرتبہ عطا کیا ہے۔تو انسان لڑ جھگڑ کیوں رہا ہے۔ یہ ملکوں کے درمیان جنگیں ، خون ریزیاں تباہ وبربادیاں یہ سب کچھ کمزور ہوتے ہمارے اخلاقی اقدار کا نتیجہ ہیں۔آج دنیا کو جنگ کی نہیں پیار ومحبت کی ضرورت ہے۔آپسی اتحاد بھائی چارگی ایک دوسری کی مدد کرنا یہ انسانی فریضہ ہے۔جس کو ہم بھول چکے ہیں۔در اصل یہی زمانے کا دستور اور انسانیت کا تقاضا ہے۔اے شریف انسانوں میں ساحرؔ نے انہیں خیالات کو پیش کیا ہے۔

خون اپنا ہو یا پرایا ہو
نسل آدم کا خون ہے آخر
جنگ مشرق میں ہو کہ مغرب میں
امن عالم کا خون ہے آخر

گذشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گذشتہ جنگ میں بہہ کر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

ساحرؔ بین الاقوامی امور پر لکھتے ہیں۔ آپ کے پاس عالم انسانیت کا درس ملتا ہے۔ اگر ساحرؔ کے کلام کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ آپ ایک سنجیدہ اور حساس ذہین وفکر کے انسان ہیں۔ ساری دنیا میں یا مخصوص طور پر ہندوستان میں ہونے والے حادثات سے بہت زیادہ پریشان ہیں۔

سارے عالم میں انسان ذلیل وخوار ہو رہا ہے۔ بس اپنے سوچ وفکر ذہن وقلب میں ایک شمع جلائے ہوئے ہے۔ اور اسے یقین ہے کہ اس کی روشنی ضرور پھیلے گی اور دنیا ظلم و جہالت سے نکل کر مساوات کی جانب آئے گی۔

سوچتا ہوں کہ محبت سے تابندہ حیات
اور یہ شمع بجھا دینا بہت مشکل ہے

ساحرؔ ایسے شاعر ہیں جو امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے۔ اُن کے کلام سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ساحرؔ پر امید ہیں حالات کے بدلنے کو لیکر۔ عوام کی زندگی میں سچائی و انصاف کے دن ضرور آئیں گے۔ ساحرؔ کا کلام حوصلہ عطا کرتا ہے یقین میں پختگی اور اعتماد میں اضافے کا باعث بنتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اُس دور کے حالات کی عکاسی بڑے دلکش اور خوش نما انداز میں کرتے ہیں کہ قاری پر لطف اور پر امید ہوجاتا ہے۔ ساحرؔ خواب کے تانے بانے میں زندگی وقوم کی تصویر یوں بناتے ہیں۔

زلفوں کے خواب ہونٹوں کے خواب اور بدن کے خواب
معراج فن کے خواب کمال سخن کے خواب
تہذیب زندگی کے فروغ وطن کے خواب

زنداں کے خواب کو چہ دارورسن کے خواب
آؤ کہ کوئی خواب بنیں کل کے واسطے
ورنہ یہ رات آج کے سنگین دور کی
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے کہ جان و دل
تا عمر پھر نہ کوئی حسیں خواب بُن سکیں

اس طرح ساحرؔ انسانیت کے علمبرداروں میں سے ایک ہیں جن کے شاعری حقیقت کا عکس ہے۔ گو یا اُن کا کلام حیات و کائنات کے موضوعات کو بڑی خوبی کے ساتھ نشاندہی کرتا ہے۔ قدیم طرز شاعری کے برخلاف ساحرؔ نے اردو شاعری کو وسیع میدان عطا کیا۔ موضوعاتِ زندگی کو شاعری کے رگ رگ میں سمودیا۔ آزادی کے بعد کے مسائل زندگی کی رنگارنگی، انسان بھیڑ میں تنہا محسوس کرنے کی کیفیت کو بڑی فن کاری کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ انسان غریب ہو یا امیر چھوٹا ہو یا بڑا کالا ہو یا گورا انسان تو انسان ہے ہماری شاعری اگر معاملات زندگی کو واضح طور پر نہ پیش کرسکے تو ایسی شاعری کا کیا مطلب جس کا تعلق حیات و کائنات سے نہ ہو۔ لہٰذا ساحرؔ نے عوام کے مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنالیا۔ اگر یوں کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ اُن کا دل عالم انسانیت کے لئے دھڑکتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ ساحرؔ لدھیانوی کی حالات زندگی کا جائزہ لیجئے۔
۲۔ ساحرؔ لدھیانوی کی نظم گوئی کی نمایاں خصوصیات پر نوٹ لکھئے۔
۳۔ ساحرؔ کی نظم تاج محل پر اظہار خیال کیجئے۔

5.7 خلاصہ

بیسوی صدی کا وہ دور جس میں شعراء نے اپنے فن کا استعمال حقائق کی ترجمانی کیلئے استعمال کیا۔ ملک کی آزدی سے قبل تحریک وتبدیلی کا زمانہ رہا۔ انسانی زندگی جدید سوچ کے ساتھ غلامی کو ناپسند کرتے ہوئے آزادی کا مطالبہ کررہی تھی۔ اردو ادب میں شعراء کرام بالخصوص، ساحر لدھیانوی، سکندر علی وجدؔ اور ن۔ م راشد نے اپنے فن کا بھرپور استعمال روایت سے ہٹ کر حق گوئی کی جانب زور دیا، سچائیوں کی مناسب ترجمانی کی۔ ادب ایک آلہ کار ہوتا ہے۔ بدلتے دور کے حالات، واقعات، حادثات کا مکمل نقشہ پیش کیا۔ ادب برائے زندگی کا فلسفہ عروج پر تھا۔ وہی ادب پنپنے لگا جس

میں زندگی کی حقیقتوں کا بیان ہو۔تعمیر ہو،عدل و انصاف ہو، بیبا کی ہو،صداقت ہو،جدید سوچ ہو،حالات سے ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا حوصلہ ہو، نابرابری کا صدیوں پرانا نظام ختم ہو، ہر ایک کو عزت و احترام کے ساتھ جینے کا حق ہو۔ظلم و بربیت، جبر و تشدد کے لئے سماج میں کوئی جگہ نہ ہو۔غریب، مفلس، لاچار، بےبس اور بے سہارہ لوگوں کے ساتھ انصاف ہو،سماج کا وہ بھی اہم حصہ ہوں۔زندگی کی دشواریوں کو دور کرتے ہوئے امن و چین کے ساتھ وہ زندگی جینے کا موقع ملے ،مذکورہ شعرانے ،حسن و عشق محبت الفت کے ترانوں کے ساتھ زندگی کے پیچیدہ مسائل کی جانب خاص کر توجہ کی اور اپنے قلم کو وقت حالات کے تناظر میں استعمال کیا۔انصاف ،رواداری ،امن اور یکسانیت کے حق میں اپنے احساسات وجذبات کا اظہار بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا۔ان شعراء نے اپنے فن کو انسان انسانیت اور انصاف کے لئے بروئے کار لایا امن و آشتی کا پیغام دیا سماج اور قوم کو ایک دھاگے میں پرونے کا کام کیا اور ہمیشہ ترقی و تمدن کی راہ اختیار کرنے کا درس دیا جو آگے چل کر ادب کو ادبیت کے تناظر میں دیکھ کر حقائق کا ترجمان بن سکے۔

5.8 نمونۂ امتحانی سوالات

(الف) درج ذیل سوالوں کے مختصر جوابات لکھیے۔

۱۔ ساؔحر کی تصانیف کے نام بتایئے؟

۲۔ ساحؔر لدھیانوی کی شاعری پر کس کی چھاپ نظر آتی ہے؟

۳۔ وجدؔ کی وفات کب ہوئی؟

۴۔ وجدؔ کی شاعری کے اہم موضوعات بتایئے؟۔

۵۔ ن۔م۔راشد کے شاعری کے موضوعات پر اظہار خیال کیجئے؟

(ب) درج ذیل سوالوں کے تفصیلی جوابات لکھیے۔

۱) ساحؔر لدھیانوی کے ادبی خدمات کا جائزہ لیجئے؟

۲) ساحؔر لدھیانوی کے کلام میں انسانیت کا درد دکھائی دیتا ہے ثابت کیجئے؟

۳) وجدؔ نے اردو غزل کے میدان کو کس طرح سیراب کیا؟

۴) وجدؔ کی غزل گوئی امتیازی خصوصیات بیان کیجئے؟

۵) ن۔م راشدؔ نے آزاد نظم کو کس طرح مقبول بنایا مدلل لکھئے؟

۶) ن۔م راشدؔ شخصیت وفن کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیجئے؟

5.9 فرہنگ

بے باک	راست گو	صالح	نیک
آہنگ	نغمہ	شائستگی	تہذیب
تصنع	بناوٹ	تنوع	رنگارنگی
دقیانوسی	قدیم۔فرسودہ	اشتراکی	سوشیلزم
تقویت	طاقت	مشاہدہ	دیکھنا
تقاضا	طلب	خدوخال	چہرہ مہرہ
معاون	مددگار	ورثہ	وراثت کا مال
تشبیہ	مثال دینا	کنایہ	پوشیدہ طور پر بات کرنا
اسلوب	انداز	سخن	شاعری
شاہکار	بڑا کارنامہ	کسوٹی	پرکھ،امتحان
گہوارہ	جھولا	شہسوار	گھوڑسواری کا ماہر
صعوبتیں	تکالیف	انتہا	آخر

5.10 معاون کتابیں

۱) تاریخ ادب اردو — رام بابو سکسینہ
۲) اردو ادب کی تنقیدی تاریخ — ڈاکٹر احتشام حسین
۳) تاریخ اردو ادب — نورالحسن نقوی
۴) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک — فخرالاسلام اعظمی
۵) اردو شاعری پر ایک نظر — کلیم الدین احمد
۶) آج کا اردو ادب — ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

☆☆☆

اکائی۔6 : حسرتؔ موہانی،جگرؔ مرادآبادی،فراقؔ گورکھپوری

ساخت :

6.1 اغراض ومقاصد
6.2 تمہید
6.3 حسرتؔ موہانی،جگرؔ مرادآبادی اورفراقؔ گورکھپوری کا عہد
6.4 حسرتؔ موہانی
6.4.1 حسرتؔ موہانی کی حیات وشخصیت
6.4.2 حسرتؔ موہانی کی ادبی خدمات
6.5 جگرؔ مرادآبادی
6.5.1 جگرؔ مرادآبادی کی حیات وشخصیت
6.5.2 جگرؔ مرادآبادی کی ادبی خدمات
6.6 فراقؔ گورکھپوری
6.6.1 فراقؔ گورکھپوری کی ادبی خدمات
6.6.2 فراقؔ گورکھپوری کی ادبی خدمات
6.7 خلاصہ
6.8 نمونۂ امتحانی سوالات
6.9 فرہنگ
6.10 معاون کتابیں

6.1 اغراض ومقاصد

الگ الگ ادوار میں کسی ایک صنف ادب کوزیادہ تقویت ملی۔کبھی غزل کو،کبھی نظم کو،کبھی آزادنظم،کوتوکبھی جدید غزل کو۔مولاناحسرت موہانی کاشمارغزل کے بڑے شعراہوتاہے۔جدیدغزل کے معماروں میں آپ کانام بڑے احترام

سے لیا جاتا ہے۔جگر مرادآبادی کا شمار شعرائے عہد جدید میں ہوتا ہے۔فراق گھورکھپوری اردو شعروادب کا ایک روشن ستارہ رہے۔ان کی شاعری اردو غزل کو مزید بلندیوں تک لے گئی۔ یہ تینوں عہد آفرین شعراء تھے۔ انھوں نے حیات اور کائنات کے مختلف موضوعات کو ادب کا حصہ بنایا۔زبان وادب کے طالب علموں کو ان شعراء کی شخصیت اور فنی کاوشوں کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اُن کی تحریریں اپنے دور کے ساتھ آنے والی نسلوں کی زندگیوں کے لئے مشعل راہ کا کام کرتی ہیں۔

6.2 تمہید

حسرتؔ، جگرؔ اور فراقؔ ،ان تینوں شعراء نے نہ صرف بہترین غزلیں لکھی بلکہ پورے ماحول کو گرمایا اور یہ باور کرانے میں کامیاب رہے کہ غزل اردو شاعری اور ادب کی نمائندگی کرتی ہے اور اردو شاعری کی جان اور ایمان ہے۔ حالات جیسے بھی ہوں،غزل لافانی فن ہونے کا ثبوت پہلے سے دیتی آئی ہے۔

حسرتؔ کی شاعری نے شاعری کے علاوہ بحیثیت ایک صحافی اپنی گہری چھاپ چھوڑی ہے۔تحریک آزدیٔ ہند میں آپ کا کردار ناقابل فراموش ہے۔جگرؔ فنی لحاظ سے ایک بڑے شاعر تھے۔جگر کو شعروسخن کے اہم معماروں میں شمار کیا جاتا ہے۔فراقؔ گورکھپوری کا شمار جدید شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو شاعری کی خدمت دل وجان سے کی۔اُن کے خدمات ہر لحاظ سے زبان وادب کے لئے بیش قیمت رہے ہیں اُن کا مطالعہ کافی گہرا تھا انگریزی ادب پر گہری نظر تھی۔

6.3 حسرتؔ موہانی،جگر مرادآبادی اور فراقؔ گورکھپوری کا عہد

حسرتؔ، جگرؔ اور فراقؔ نے کم وبیش بیسویں صدی کی دوسری دہائی سے شاعری کا آغاز کیا۔ وہ دور انقلابوں تحریکوں اور تبدیلیوں کا تھا۔علامہ اقبال کی شاعری بامِ عروج پر تھی۔حالیؔ کی سخت چوٹوں اور نقادوں کی سخت اعتراضات سے اردو غزل پر اثر ہوا لوگ غزل کو چھوڑ کر نظموں کی جانب راغب ہونے لگے ترقی پسند دور سے قبل ایسا ماحول بننے لگا تھا ۔اس عہد میں اردو شاعری نے حیات اور کائنات کے مسائل کو بڑی ہی خوش اسلوبی سے پیش کیا۔

اس دور میں غزل گو،شعراء نے اپنے کمالِ فن اور زورِ زباں کی وجہ سے ادب کو روشن خیالی اور وسعت بیانی کا نمونہ بنادیا۔ یہ زمانہ جدید ذہن اور جدید طرز کی شاعری کا رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقوامِ عالم ایک دوسرے کے قریب آرہے تھے۔جدید ومغربی علوم نے سوچ وفکر کے زاوئے بدل دئے۔ پرانے اور دقیانوسی خیالات ونظریات کی جگہ جدید سوچ اور غور وفکر کی راہیں کھلتی گئیں اور لوگ مختلف علوم سے فیضیاب ہونے لگے۔زندگی کی سوچ بدلنے لگی اور عالم انسانیت کا تصور

عام ہونے لگا۔صدیوں پرانی ظلم وستم کی زنجیریں ٹوٹنے لگے۔سرمایہ دارانہ نظام کی جڑی ہلنےلگیں۔ یہ تمام باتیں ادب کا حصہ بنیں اور ایک صحت مند تبدیلی کا باعث بن گئی ۔خیال میں وسعت اور رفعت پیدا ہوئی۔ زندگی کے معاملات کوسنجیدگی سے لیا گیا۔سائنس نے بےشمار ترقی کی زندگی کے ہر حصے وشعبے کوسائنس نے متاثر کیا۔اس تبدیلی سے زندگی کے ہر معاملے میں سائنسی نقطۂ نظر کو اپنایا گیا۔زندگی کی تلخ حقائق کی ترجمانی شاعری کے ذریعے ہونے لگی ۔سوچوں کا دائرہ وسیع ہوگیا۔ یہ دور سیاسی،سماجی ادبی،فکری وبصری،تبدیلیوں کا دور رہا۔جھوٹ اور مبالغہ آرائی سے لوگ دور ہونے لگے۔ یہ دور غزل اور نظم دونوں اعتبار سے کامیاب رہا۔جدید اور مغربی علوم نے ادیب وشاعر کونئی سوچ اورنئی فکرعطا کی۔

اس دور یا عہد میں حسرتؔ موہانی نے شاعری شروع کی تو بیسویں صدی کی ابتدائی دہائی جو ہندوستان اور دنیا کے عظیم تبدیلیوں ،انقلابوں اور تحریکوں کا عروج تھا۔ ظاہر بات ہے کہ کوئی شاعر جب لکھتا ہے اُن حالات ،واقعات اور حادثات سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتا ہے ۔لہٰذا حسرتؔ کی شاعری اُن کی زندگی ،تجربات ومشاہدات کا حاصل ہے۔حسرتؔ نے اپنے کلام کے ذریعے فطرت کی بہترین عکاسی کی ہے اور ساتھ ہی اُن کا کلام جدید طرز اور خوبصورت انداز ،زبان وبیان کی کشش کا نادر نمونہ بھی مانا گیا۔حسرت کا دور ہندوستان کی تحریک آزادی کے عروج کا زمانہ تھا لہٰذا آپ بھی اس عظیم تحریک کا ایک حصہ بنے۔اکثر شعراءغزل کو چھوڑ کر نظموں کی جانب راغب ہوئے لیکن غزل اپنی روایتی ساخت،شان وعظمت کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہی۔ بدلتے زمانے اور حالات کے تقاضوں پر غزل کھری اتری اور حیات اور کائنات کے مسائل کو اپنے دامن میں جگہ دی ۔مکمل زندگی کی ترجمانی کا فرض نبھانے میں غزل پیش پیش رہی۔ادب میں حسن وعشق کی اہمیت برقرار رہی کیونکہ یہ بھی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس طرح زندگی کے دیگر معاملات کوشعر وادب کا موضوع بنا کر پیش کیا گیا۔ایک نئی سوچ ایک نئی اُمنگ نظر آنے لگی۔ جو زندگی کو نئے زاوئے نگاہ سے دیکھنے پرکھنے اور گزارنے کا سلیقہ وطریقہ بتاتی ہے۔اس طرح ادب میں ایک خوبصورت تبدیلی نمایاں طور پر دکھائی دینے لگی جس میں جگر کا ایک بڑا حصہ ہے۔فراق کا براہ راست تعلق ترقی پسند تحریک سے تھا۔ اس کے اصول ونظریات سے فراق بہت زیادہ متاثر تھے۔علامہ اقبال کی شاعری عروج پر تھی ۔انہوں نے ایک نئے انقلاب اور نئے زمانہ کا تصور پہلے ہی پیش کر چکے تھے۔ پریم چند کی تحریریں صدیوں پرانے سماجی امتیازات کو دور کرنے میں معاون ثابت ہو رہی تھی سماج کے غلط اصولوں وبندھنوں سے لوگ تنگ آ گئے تھے۔ایک خوشنما تبدیلی کی سحر کے سبھی منظر تھے۔اردو ادب کو ولولہ انگیز تبدیلیوں اور نوجوانوں کی نئی سوج اور حکمتِ عملی کوشعر وادب کا حصہ بنانا مقصود تھا۔ بغاوت کا علم بلند ہوگیا۔ ہر طرف مساوات کی چیخ وپکار عام تھی۔ ہر جانب قدیم دقیانوسی وفرسودہ عقائد سے چھٹکارہ پانے کی مہم تیز ہوگئی تھی۔ملک میں تعلیم نسواں اور عورتوں کی شرکت ناگزیر تھی ۔اشترا کی نظریہ زور پکڑنے لگا۔انقلابی جوش نے سرمایہ دارانہ نظام کو روند کے رکھ

دیا۔قومی بیداری کی لہر نے صدیوں پرانی ظلم جبر و بربریت کے در و دیوار ہلا دیئے۔لہٰذا فکر و نظر اور اظہارِ خیال کی آزادی کی جانب تیزی سے قدم بڑھ رہے تھے۔ایسے دور میں فراق نے اردو غزل کو ایک الگ مقام عطا کیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ حسرتؔ موہانی کا عہد کس لئے مشہور ہے۔

۲۔ جگرؔ بنیادی طور پر کس صنف کے شاعر ہیں؟

۳۔ فراق گورکھپوری کس تحریک سے براہ راست طور پر جڑے تھے؟

۴۔ فراق گورکھپوری کا زمانہ ہندوستان میں کیسا تھا؟

6.4 حسرتؔ موہانی

6.4.1 حسرتؔ موہانی کی حیات وشخصیت

سید فضل الحسن نام حسرت تخلص، موہان ضلع اُنّاؤ آپ کا وطن تھا۔اس مناسبت سے حسرت موہانی کے طور پر مشہور ہوئے۔1881ء میں آپ کی ولادت ہوئی۔روایتی طرز پر ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔پڑھنے لکھنے کا شوق بچپن سے ہی تھا لہٰذا مزید تعلیم کے لئے علی گڈھ کا سفر کیا جو اُن دنوں علم و ادب اور اعلیٰ وجدید تعلیم کا گہوارہ تھا۔علی گڑھ سے بی۔اے ،امتیازی نشانات کے ساتھ کامیاب ہوئے۔شعر و شاعری کا جذبہ بچپن سے تھا۔اسی طرح شعر و سخن کی تڑپ اُس دور کے نامور شاعر تسلیمؔ کی شاگردی کا باعث بنی۔تسلیمؔ،نسیمؔ دہلوی کے شاگرد تھے اور نسیم دہلوی مومنؔ کے شاگرد اس طرح یہ سلسلہ شعر و سخن کے عظیم شہسواروں تک جا کر پہنچتا ہے۔جن پر خود حسرتؔ کو اس سلسلہ تلمذ پر ہمیشہ ناز رہا۔خود اس کا اظہار بڑے فخر کے ساتھ کرتے ہیں۔

حسرتؔ تیری شگفتہ کلامی پہ آفریں
یاد آگئیں نسیم کی رنگیں بیانیاں
حسرتؔ یہ وہ غزل جسے سن کے سب کہیں
مومنؔ سے اپنے رنگ کو تونے ملا دیا

شعروادب کے علاوہ حسرت کوسیاست میں بھی دلچسپی تھی۔علی گڈھ کی مقامی سیاست میں بھی بڑھ چڑھ کرحصہ لیا ۔آپ ایک کامیاب شاعر،ادیب صحافی ،سیاست دان ،نقادبھی تھے۔بحیثیت شاعر جتنے آپ کامیاب رہے اسی طرح سیاست دان بھی کامیاب رہے۔تحریک آزادی کے اس مردِمجاہد نے ہی انگریزوں کے خلاف مکمل آزادی کاریزویشن پیش کیا۔اُن دنوں حسرت کی باتیں اوراُن کی کارگزاریوں کاچرچہ عام تھا۔مزاج میں بے باکی اورصاف گوئی تھی۔خلافت ،کانگریس،مسلم لیگ سے جڑے لیکن مزاج کی بیباکی کسی کوراس نہ آئی۔تحریک آزادی کی خاطر ہمیشہ سرگرم رہے قیدوبند کی صعوبتیں بھی برداشت کی۔جس وقت حسرت نے اردوغزل کادامن تھاما اُسی دور میں غزل پرطرح طرح کی بدگمانیاں پھیل گئی تھی۔لیکن حسرت نے اردوغزل کے دامن کومزید وسیع کیااورحیات اورکائنات کے مختلف موضوعات غزل میں پیش کئے۔خوداپنے الفاظ میں لکھتے ہیں؛

’’راقم الحروف کی طبیعت نے اپنے لئے اصناف سخن میں غزل کواپنے حسبِ حال پاکرمنتخب کرلیاہے۔‘‘

ایک اورجگہ لکھتے ہیں :

لکھتاہوں مرثیہ نہ قصیدہ نہ مثنوی
حسرت غزل ہےصرف مری جان عاشقاں

اُن کی شاعری کامرکز ومحورعشق ہےاُن کے کلام میں عشق کی ساری کیفیات اورحسن کے سارے روپ نظرآتے ہیں۔ حسرت 13رمئی1951ءکووفات پائی۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ حسرت موہانی کب اورکہاں پیداہوئے؟
۲۔ حسرت موہانی نے بی۔اے کس یونیورسٹی سے کیا؟
۳۔ حسرت کی سیاسی سرگرمیوں کاجائزہ لیجئے؟

6.4.2 حسرتؔ موہانی کی ادبی خدمات

حسرتؔ موہانی کی شخصیت فطری طور پر ایک کامیاب شاعر کے طور پر جانی پہچانی گئی گوکہ ایک صحافی ،ایک سیاست دان اورتحریکِ آزادی ہند کے مردِمجاہد کےطور پربھی اُنکا نام بڑے آب وتاب کے ساتھ لیاجاتا ہے۔حسرتؔ کا مطالعہ کافی گہرا تھا ،اُس دور میں آپ نے اردو اور فارسی شعراء کے کلام کا مطالعہ کیا پہلے سے آپ بڑے ذہین تھے۔حصول علم کی تڑپ، تحقیق وتنقید کی جستجو نے آپ کوایک بڑا شاعر نامورادیب اور کامیاب صحافی کےطور پرمقبولیت کی اونچائیوں پر پہنچادیا۔

حسرتؔ حسن پرست اور عاشق مزاج شاعر تھے۔ان کا عشق خالص عشق مجازی ہے۔اپنے اساتذہ جن میں تسلیمؔ صاحب کارنگ آپ کے کلام میں نظر آتا ہے۔ یہ سلسلہ اور لگاؤ نسیمؔ اور مومنؔ کے کلام طرز وانداز سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔اُن کی شاعری مخصوص طور پراُن کی غزلیں،عشقیہ موضوعات سے پُرنور ہیں۔ایسا لگتاہے کہ آپ کی شاعری عشق کے اطراف طواف کرتے ہوئے معلوم ہوتیہے۔اس کے لئے وہ ہرمناسب پہلواورطریقے کارکواپناتے ہیں۔فن شاعری کی تمام کیفیات ولوازمات کواستعمال کرکے فکر وخیال کے حسین و دلکش پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔فنی باریکیاں جیسے ،القاب ،استعارات ،کنایات ،محاورے ،ضرب المثل اورشاعری کی مختلف بحروں سے پُرلطف انداز میں پیش کرنے میں حسرتؔ کا جواب نہیں۔جس سے شعر میں حسن معنوی اورفنی خوبیوں سے کلام میں وزن اورخیال میں گہرائی کے عناصر نمودارہوتے ہیں۔اُن کی شیریں کلامی ورنگیں بیانی ہرلحاظ سے ادب کی جان اورشاعری کاایمان ہے۔چنداشعاردیکھیے:

توڑ کر عہدِ کرم ناآشنا ہو جائے
بندہ پرور جایئے اچھا خفا ہو جائے

دل اور تہیہ ترکِ خیال یاد کرے
کسے یقین ہوں کون اس کا اعتبار کرلے

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں

بقول آل احمد سرور

''عشق ہی ان کی عبادت ہے عشق کی راحت اور فراغت کا یہ تصور اُن کا اپنا ہے
اور یہ تصور ہی حسرتؔ کو نیا اور اپنے زمانہ کا ایک فرد ثابت کرسکتا ہے''۔

اردو غزل گوئی کی تاریخ میں حسرتؔ کا نام ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ حسرتؔ کی غزلیں تغزل کے رنگ سے بھرپور تھی۔ حسرت کی زبان نہایت ہی سادہ خیال وفکر کے لحاظ سے معنی خیز تھی۔ لفظوں کے استعمال میں حسرتؔ کا جواب نہیں ملتا۔ اُن کی غزلیہ شاعری میں ایک ترنم اور لَے کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اُن کے کہئے ہوئے اشعار دہائیاں بیت جانے کے بعد بھی مقبولیت کی اونچائیوں پر نظر آتے ہیں۔ خیال وفکر کی گہرائی فصات و بلاغت کے اعتبار سے حسرتؔ ایک بلند پایہ شاعر ہیں۔ اور کلام میں تسلسل سے ہر کوئی متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

اردو شاعری کے ارتقاء اور فروغ میں حسرتؔ کا کردار کافی اہم ہے۔ اُن کا خیال، انداز، دراصل کلاسیکی شاعری کا ایک عکس معلوم ہوتا ہے۔ تبھی تو اُن کا رجحان بڑے شعرائے کے طرز کلام سے جاملتا ہے۔ اُن کی غزل گوئی میں ایک گدگدی، چھیڑ چھاڑ یعنی جذبات واحساسات کی صحیح ترجمانی ملتی ہے۔ بقول احتشام حسین:

''حسرتؔ کی شاعری کا محور محبت ہے''۔

شعر سے متعلق خود حسرتؔ کی رائے اس طرح ہے:

شعر دراصل ہیں وہی حسرتؔ
سنتے ہی دل میں جو اتر جائے

حسن کی مصوری اور جزئیات کی مصوری میں حسرتؔ کی بعض غزلیں لکھنؤ سے قریب آجاتی ہیں۔ لکھنوی رنگ ادا اور انداز سخن گوئی کی چھاپ واضح دکھائی دیتی ہے۔

بزم اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے
ہاتھ آہستہ میرا پھر بھی دبا کر چھوڑا

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہار حسن
آیا میرا خیال تو شرما کے رہ گئے

حسرتؔ کے اشعار میں زبان سادہ اور سلیس ہوتی ہے۔زبان و بیان میں خلوص اور سچائی کے عناصر نظر آتے ہیں۔اردو شاعری کے میدان کو آپ نے فنی ومعنوی خوبیوں سے بھر دیا۔حالات کے تناظر میں حسرت کا نظریہ بالکل واضح ہے جواُن کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

اردو شعرا نے ہندستان کی تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اپنی گراں قدر خدمات انجام دیں۔انگریزی سامراجیت کے خلاف کھل کر بے با کی سے لکھا۔جوش وجذبے اور صداقت وسچائی کو پیش کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ،قید وبند کی صعوبتیں بھی جھیلیں اس سبیل میں مولانا حسرتؔ موہانی نے تحریک آزادی کو ایک ولولہ ایک جذبہ دیا۔''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ 1921 میں آپ ہی نے دیا۔جو پوری تحریک آزادی کا اہم حصہ رہا۔اکثر جلسے جلوسوں میں اس کا کثرت سے استعمال ہوا۔یہ نعرہ تحریک آزادی میں علامتی طور پر ہر خاص وعام کے زبان پر جاری وساری رہا۔جوش وجذبے کے لحاظ سے ہم وطنوں میں مادرِوطن کی الفت،محبت اور چاہت میں مر مٹنے کی تڑپ پیدا کی۔

آپ کے تصانیف،دیوانِ حسرتؔ موہانی،انتخاب سخن،انتخاب کلام حسرتؔ،تذکرۂ شعراء،نکاتِ سخن،محاسن سخن وغیرہ ہیں۔1903 میں علی گڑھ سے اردوئے معلیٰ نکالا،تذکرۃ الشعراء 1941 رسالہ،استقلال 1921 رسالہ اور 1928 میں مستقل رسالہ نکالا۔اس طرح حسرتؔ موہانی کے صحافتی خدمات بڑے اہم رہے۔جو قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں اُس دور میں اردو اخبارات کی اشد ضرورت تھی دور و دراز لوگوں سے رابطے کا ذریعہ صرف اخبارات تھے۔حسرتؔ موہانی نے اپنے زور قلم،زور بیان اور ہمت سے عوام تک رسائی حاصل کی اور اپنے خیال وفکر کو عوام الناس میں عام کیا۔اس طرح حسرتؔ موہانی کی شخصیت کے مختلف پہلو تھے اور اُن کے خدمات کا دائرہ کافی وسیع ہے۔میدان سیاست کے بھی آپ شہسوار تھے۔ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی بنیاد رکھنے والوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ حسرت موہانی کی حالات زندگی کا جائزہ لیجئے۔

۲۔ حسرت کی غزل گوئی کی نمایاں خصوصیات پر نوٹ لکھئے۔

۳۔ حسرت کی شاعری کا محور عشق ہے واضح کیجئے۔

۴۔ حسرت کے کلام پر کن شعراء کی چھاپ نظر آتی ہے۔

6.5 جگر مرادآبادی

6.5.1 جگر مرادآبادی کی حیات وشخصیت

علی سکندر نام،جگر تخلص وطن مرادآباد تھا آپ کی ولادت 1890 میں ہوئی۔ان کے مورثِ اعلیٰ مولوی محمد سمیع شاہ جہاں کے استاد تھے۔ایسا کہا جاتا ہے کہ کسی بات پر بادشاہ اُستاد سے ناراض ہو گئے تو ان کے آباد واجداد ترکِ وطن کر کے مرادآباد منتقل ہوئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔والد مولوی نظر علی صاحب ِدیوان شاعر تھے۔انہوں نے اپنے کلام کی اصلاح خواجہ وزیر لکھنوی سے لی۔جگر کی تعلیم کوئی زیادہ نہیں تھی اور وسیع مطالعے کا شوق بھی کچھ خاص نہیں تھا۔لیکن شاعری تو وراثت کا ایک حصہ تھی۔کیونکہ باپ دادا پردادا اس سے وابستہ تھے تو جگر کے خون میں ہی شعر گوئی کے اوصاف موجود تھے۔14 برس کی عمر سے ہی شعر کہنا شروع کیا۔ابتدا میں والد صاحب سے کلام کی اصلاح لی پھر داغ سے آخر میں منشی امیراللہ تسلیم سے تلمذ کا رشتہ قائم کیا۔

جگر کے کلام سے آپ کو کسی فلسفے یا گہرائی نہیں ملے گی کیونکہ آپ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔بس وہ روایتی شاعری اور روایتی موضوع کو نئے رنگ وروپ میں پیش کرتے ہیں۔وہ عشقِ مجازی کے گوناگوں کیفیتوں کے شاعر ہیں۔جن شعراء سے آپ نے کلام کی اصلاح لی وہ بھی اپنے میدان کے یعنی حُسن وعشق کے بڑے شعراء میں شمار تھے۔محبوب کا سراپا حسن،عشق کی مختلف کیفیات اور حسن وعشق،حسن وبیان کی خوبصورتی،زبان،انداز اور موضوع کافی متاثر کرتا ہے۔عشق ومحبت آپ کی زندگی اور فطرت کا نمونہ معلوم ہوتے ہیں۔محبت کا نشہ اور شراب کا نشہ حد درجہ موجود تھا ۔شراب نوشی ہمہ وقت رہتی،جابجا اُن کے اشعار اُن کی زندگی،حالات اور مے نوشی کا بین ثبوت ہیں۔فارسی شاعری کا مطالعہ ضرور تھا لیکن فارسی تراکیب سے گریز کیا۔اصغر گونڈوی کے مشورے پر شراب نوشی ترک کی اور تصوف کے موضوع پر لکھنے لگے۔لیکن حسن وعشق جمیل وجمال کا شاعر کسی طرح رند ومئے پر ہمیشہ لکھتا رہا۔علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں مجموعی خدمات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ڈی لِٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔1960 میں گونڈہ میں جگر نے وفات پائی۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ جگر کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

۲۔ جگر نے اپنے کلام کی اصلاح کس سے لی؟

۳۔ جگر کو کس یونیورسٹی نے ڈِی لِٹ کی ڈگری سے نوازا؟

6.5.2 جگرمرادآبادی کی ادبی خدمات

جگر کی تعلیم کوئی زیادہ نہیں تھی مطالعہ بھی سطحی رہا گو کہ اردو و فارسی ادباء شعراء کے تصانیفات سے آگاہ تھے۔لیکن خاندان وراثت میں شعروادب ودیعت تھا۔والد اچھے شاعر تھے۔اُن کا اپنا دیوان تھا۔اس طرح جگر نے شعروادب کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔چودہ برس کی عمر سے ہی شعروشاعری کی جانب مائل ہو گئے۔پہلے اپنے والد سے پھر داغ اور منشی امیر اللہ تسلیم سے کلام کی اصلاح لی،ظاہر ہے ان اکابرین کی صحبت واصلاح نے جگر کو ایک قابل شاعر کے صف میں لاکھڑا کیا۔اورزمانے ان کے فن کی قدر کی۔

جگر کی شاعری حسن وعشق،پیارومحبت،روٹھنا،منانا،بناؤسنگھار،گلے شکوے،سراپاحُسن،شراب وشباب،حسن و جمال،کیفیات عشق اور محبوب کی تعریف جیسے موضوعات سے بھرپور ہے۔جگر کے تین مجموعے کلام شائع ہوئے۔''داغ جگر''،''شعلۂ طور''اور تیسرا''آتش گل''،آتش گل مجموعہ کلام کو1958 میں ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ نوازا گیا۔اس طرح جگر کا مختصر کلام اُن کو شہرت وبلندیوں کی اونچائیوں پر پہنچادیا۔

شباب اور شراب،جگر کی شاعری کے اہم عنصر ہیں۔اپنی شاعری میں زبان وبیان کی عمدگی،الفاظ کا برملا استعمال،مناسب ترکیبیں،خوبصورت،استعارات،کنایات،نادر تشبیہات،دیگر شعری وفنی خوبیوں کی وجہ سے شاعری میں جان ڈال دی جو انہیں دوسروں سے ایک ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔شعری حسن کے لحاظ سے جگر کا کوئی جواب نہیں ملتا وہ اس میدان کے ایک کامیاب شاعر ہیں آپ نے ادب کی صالح روایات کو برقرار رکھا اس کی پاسداری کی اور اس میں بیش بہا اضافہ بھی کیا۔اس طرح فنی باریکیوں کا لحاظ جگر نے رکھا جس سے اُن کا کلام حسن وخوبی کے اعلیٰ مسند پر نظر آتا ہے۔زبان میں روانی اور اظہار میں دلکشی نے جگر کو لاجواب مقام عطا کیا۔ان کے یہ اشعار اس کا بین ثبوت ہیں:

پیتا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال
درپردہ چشم یار کی شہ پاکے پی گیا

ہم کو مٹا سکے، یہ زمانے میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے زمانے سے ہم نہیں

ایک لفظ محبت کا ادنیٰ یہ فسانہ ہے
سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

جگرؔ کو اردو غزل کا شہنشاہ کہا جاتا ہے، حالانکہ دیگر اصناف شاعری میں بھی آپ نے طبع آزمائی کی لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جگرؔ غزل کے لئے اور غزل جگرؔ کے لئے ہی بنے ہیں۔ تغزل کا رنگ جگرؔ کی شاعری کو لازوال بنا دیا اور ان کا رنگ سخن، آہنگ، انداز بیان کی خوبصورتی، مناسب تراکیب، لفظوں کا رکھ رکھاؤ، خیال وفکر کی سادگی، حسین پیرائے اظہار نے جگرؔ کی غزلوں کو حیاتِ جاویدانی عطا کی۔

ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے، جہاں تک پہنچے

اے رحمتِ تمام میری ہر خطا معاف
میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

جگرؔ نے اُردو غزل کو ایک نیا مقام عطا کیا اُن کی شاعری حسرتوں اور آرزوؤں کی رہی، خلوص و چاہت کے موضوعات سے پر مغز شاعری ادب کے میدان کو وسیع تر کرتی گئی۔ قاری کے ذہن وفکر کو لطف اندوزی کے ساتھ ایک حسین پیغام کا وسیلہ بھی بنی۔ دلی جذبات واحساسات کا برملا اظہار جگرؔ نے جگر کاری کے ساتھ اس کا ہر کوئی قائل ہے۔ لفظوں کے مناسب استعمال، خوبصورت تراکیب، شعری وفنی لوازمات کو پورا کرتی اُن کی شاعری ادب کو زرخیز کرتی رہی معنوی اعتبار سے جگر کا کلام اردو کے سنہرے دور کی یاد دلاتا ہے۔ حالات کیسے بھی ہوں صالح روایات کی پاسداری ہونی چاہئیے۔ قدیم ودقیانوسی خیالات کو نکال کر جدید سوچ کو استعمال میں لا کر حالات حاضرہ کے پس منظر میں شاعری کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ جگر نے اردو غزل کو آسمان کی بلندیاں عطا کی، کائنات کے مسائل کو غزل کا حصہ بنایا۔ محبوب غزل کا سب سے بڑا موضوع ہے۔ جگر نے محبوب کے ساتھ زندگی کو ادب کا حصہ بنایا معاملات زندگی کو منظر عام پر لایا۔ زبان وبیان کی جملہ خصوصیات کی بنا پر جگرؔ کا مقام بہت اعلیٰ ہے۔ فصاحت وبلاغت نے جگرؔ کی شاعری میں حسن اور اثر پیدا ہوا۔

اپنے مطالعہ کی جانچ

۱۔ جگرؔ کے تصانیف کے نام بتایئے؟

۲۔ جگرؔ نے اردو غزل کو کیا مقام دیا؟

۳۔ جگر کے ادبی خدمات کا احاطہ کیجئے۔

6.6 فراق گورکھپوری

6.6.1 فراق گورکھپوری حیات وشخصیت

رگھو پتی سہائے نام فراق تخلص گورکھپور آپ کا وطن تھا۔1896ء میں پیدا ہوئے ۔ابتدائی تعلیم خاص کر اردو کا آغاز گھر پر ہی ہوا،فراق کے والد کا نام منشی گورکھ پرشاد تھا جو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پیشے سے وکیل تھے۔شعروشاعری سے لگاؤ تھا۔خودشاعری کرتے ،عبرت تخلص اختیار کیا تھا۔فراق کی تعلیم وتربیت میں والد نے کوئی کسر نہیں چھوڑی ،فراق علم وادب ،تہذیب وشائستگی کا درس برابر ملتا رہا۔ پہلے سے آپ ایک ذہین اور محنتی تھے۔علم کا شوق وذوق تھا۔مطالعہ گہرا تھا۔اعلیٰ تعلیم کے لئے الہٰ آباد آ گئے اور میور سنٹرل کالج میں داخلہ لیا۔

اپنے بچپن کے ذوق یعنی مشاعروں کے رواج کو کالج میں عام کیا۔اُس دوران پروفیسر ناصری عربی وفارسی کے اُستاد تھے۔شعروشاعری کا ماحول گرم تھا۔نوجوانوں میں پروفیسر ناصری نے شعروسخن سے لگاؤ ورغبت پیدا کی جس کا گہرا اثر فراق کی شخصیت پر ہوا۔اُسی دوران فراق بھی شاعری شروع کی اور پہلے پہل پروفیسر ناصری سے ہی کلام کی اصلاح لی اور بعد میں وسیم اختر آبادی کو اپنا کلام دکھا کر اصلاح کرانے لگے ۔اُس وقت بی اے کی سند اعلیٰ نمبرات سے حاصل کئے ۔انگریزی حکومت نے انہیں ڈپٹی کلکٹر جیسے بڑے عہدے پر فائز کیا۔لیکن فراق کو یہ منظور نہیں تھا کیونکہ اُن کی دلچسپی وطن کی مکمل آزادی میں تھی ۔اُسی اثنا میں آپ تحریک آزادی میں شامل ہو گئے کئی بار جیل جانا پڑا لیکن ارادوں کی پختگی اور ہمت وحوصلے نے انہیں کہیں بھی جھکنے نہیں دیا۔اسی طرح جیل کی زندگی فراق کے ذہن وفکر پر کافی اثر کر گئی ۔تجربات ومشاہدات نے فراق کو ایک بڑے کام کیلئے حوصلہ عطا کیا جو آگے چل کر اُس کی راہیں ہموار ہوتی گئی۔ آپ میں آزادی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا وطن عزیز کے لئے کچھ کرنے کی چاہت غضب کی تھی انگریزی سامراجیت کے خلاف پرزور آواز اٹھانے کی ہمت بنی جس سے زندگی کی تصویر بدلنے میں معاون ثابت ہوئی۔اُس وقت جیل میں بڑے اہم معتبر اور نامور لوگوں سے ملنے کا موقع ملا جن میں عارف ہنسوی،حکیم آشفتہ،مولانا محمد علی،حسرت موہانی اور مولانا آزاد جیسی ہستیوں سے ملاقاتیں زندگی کا رخ بدل دی۔1927ء میں جیل سے رہائی کے بعد کرسچن کالج لکھنو میں لکچرر بن گئے ۔سناتن دھرم کالج کانپور میں اردو پڑھائے ، انگریزی ،ایم اے کیا اس طرح الہٰ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر بن گئے ۔بڑے اعزازات سے نوازا گیا اردو کا پہلا گیان پیٹھ ایوارڈ مجموعہ ’گلِ نغمہ‘ کے لئے ملا۔آپ شعروسخن کے شہنشاہ اور اردو غزل کے تاج بادشاہ بن گئے ۔1982 میں انتقال ہوا۔

اپنے مطالعہ کی جانچ

۱۔ فراق گورکھپوری کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

۲۔ فراق گورکھپوری کو اُن کی کس تصنیف پر گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا؟

۳۔ فراق گورکھپوری کو جیل میں کن معتبر ہستیوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا؟

6.6.2 فراق گورکھپوری کی ادبی خدمات

فراق گورکھپوری عمر کے لحاظ سے تو جوش اور اختر شیرانی کے عہد کے ہیں لیکن اُن کی شاعری کے خدوخال کا پتہ ترقی پسندوں کے دور میں ہوا۔فراق کی پہچان شروع سے ہی ترقی پسند تحریک سے رہی۔اس تحریک کے اصول،قاعدے ،اصول ونظریات کو اپنایا۔فراق کی سوچ جدید اور نئے لب ولہجہ کے ساتھ اردو شاعری کے گلستان کو روشن کرتے رہے۔ اردو غزل کو ایک نئی آواز،انداز،اور مقام عطا کرنے میں آپ کا مقام بڑا اہم ہے۔فراق کی عشقیہ شاعری محض روایتی طرز کی نمائندگی نہیں کرتی بلکہ اُس میں بیسویں صدی کے حالات،تقاضے اور سوچ نظر آتی ہے۔فراق نے ایک نسل کو متاثر کیا ہے جس طرح آپ کی غزلیں اپنی مقبولیت کی اونچائیوں پر پہنچی بالکل اُسی طرح آپ کی نظم گوئی معنوی طور پر اہم ہے۔ آپ ایک غیر سیاسی شاعر ہیں۔جدت آپ کی شاعری کا ایک اہم عنصر ہے۔زبان کی فصاحت لاجواب ہے اور بلاغت کے اعتبار سے آپ کا کلام ممتاز مقام رکھتا ہے۔

انہوں نے اردو نظم میں جدید اشاریت اور علامتی اسلوب کو رائج کیا،آپ انگریزی کے رومانی شعراء جیسے ورڈسورتھ،شیلی،کیٹس،کولرج،ٹینی سن اور سون برن سے زیادہ متاثر تھے۔سنسکرت زبان،بھاشا سے بہت کچھ فیض پایا ۔اپنی نظموں میں ایک نئی آواز لے اور فضا قائم کرنے میں کامیاب رہے۔بقول عزیز احمد :

''راشدؔ اور فیضؔ کے بعد جدید نظم نگاری کے معیار پر صرف فراقؔ کی نظمیں پوری اترتی ہیں''

فراق کا اسلوب اور ان کی آواز اردو شاعری میں ایک الگ مقام رکھتی ہے۔فراق بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔لہٰذا اُن کی شاعری اردو غزل کی مقبولیت اور فن میں اضافہ کا باعث بنی۔فراق حُسن وعشق کے ساتھ،سیاسی،سماجی مسائل پر بھی لکھا جن کا براہ راست تعلق انسان سے ہے اور انسانی زندگی اور سماج سے ادب کا براہ راست تعلق ہوتا ہے لہٰذا فراق نے اپنی شاعری کے ذریعہ انسانوں کے مسائل کو،جن میں طبقاتی کشمکش بھی شامل ہے پیش کیا اگر یوں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ آپ کی شاعری ہندوستانی تہذیب وکلچر کی نمائندہ ہے۔فراق بیک وقت شاعر اور نقاد تھے۔فرمان فتحپوری،اپنی

تصنیف 'جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری' میں فراق سے متعلق لکھتے ہیں :

''حالیؔ اور فراقؔ کے سوا کوئی بھی بیک وقت اپنے عہد کا ممتاز شاعر اور ممتاز ناقد نہ بن سکا''

فراق کی تنقید تاثراتی تنقید کے زمرے میں آتی ہے۔ وہ انگریزی ادب اور نقادوں سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔

فراق نے اردو غزل کو شاعری کی جان اور عطر قرار دیا۔ آپ نے غزل میں نت نئے اضافے کئے۔ موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے صحت مند تبدیلی و اضافے کا پتہ چلتا ہے۔۔ فراق کی تصنیفات، اندازے، چراغاں، حاشئے، روپ، روح کائنات، شبنمستا، غزلستاں، گل نغمہ، مشعل ہیں۔ فراق کا مشہور و معروف مجموعہ کلام گلِ نغمہ کو اردو کا پہلا گیان پیٹھ ایوارڈ ملا۔ فراق نے اپنی شاعری میں نرم اور شیریں ہندی لفظوں کا بھی استعمال کیا۔

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

پہروں پہروں تک یہ دنیا بھولا سپنا بن جائے ہے
میں تو سراسر کھو جاؤں ہوں، یاد اتنا کیوں آؤ ہو

<u>اپنے مطالعہ کی جانچ</u>

۱۔ فراق نے اپنے کلام کی اصلاح کس سے لی؟

۲۔ فراق کے تصانیف کے نام بتایئے؟

۳۔ فراق کی شعری خدمات کا جائزہ لیجئے؟

6.7 خلاصہ

اردو شاعری کا جدید دور ہر لحاظ سے زبان و ادب کے لئے سودمند رہا۔ موضوعات، اسلوب، انداز کے اعتبار سے بہت ساری تبدیلیاں رونما ئیں، ادب انسانی زندگی سے قریب سے قریب تر ہونے لگا، حسرتؔ، جگرؔ اور فراقؔ کی شاعری، حسن و عشق، پیار و محبت کے ساتھ زندگی کے مسائل کی عکاسی کرنے میں کامیاب رہی۔ زمانے کے تقاضوں پر کھری اُتری ہے۔ اُن کی شاعری دلی جذبات کے اظہار احساسات و تفکرات کی واضح ترجمان ہے۔ مذکورہ تینوں شعراء

نے اپنے جذبات، احساسات کا اظہار بڑے موثر انداز میں کیا۔علم، مطالعہ، تجربہ ومشاہدہ نے انہیں دعوت فکر دی اپنے فن کو سماج وقوم کیلئے مختص کیا۔انسانی مسائل کو وقت اور حالات کے تناظر میں رکھ کر دیکھا سائنٹفک سوچ پیدا کی ادب میں جدید سوچ وفکر کو اپنایا سماج اور قوم کو ایک راہ دکھلائی۔ادب کو زندگی کا ترجمان بنایا۔طبقوں، فرقوں، گروہوں میں بٹے ہوئے سماج کو ایک دھاگے میں پرونے کی کوشش کی۔ادب میں ادبیت کو فروغ دیا۔ادب برائے زندگی کو فروغ دیا۔

6.8 نمونۂ امتحانی سوالات

(الف) درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

۱۔ حسرتؔ موہانی کے تصانیف کے نام بتایئے؟

۲۔ حسرتؔ موہانی کی شاعری پر کس کی چھاپ نظر آتی ہے؟

۳۔ جگرؔ مرادآبادی کی وفات کب ہوئی؟

۴۔ جگرؔ نے کس شاعر سے اپنے کلام کی اصلاح لی؟

۵۔ فراق گورکھپوری کے تصانیف کے نام بتایئے؟

۶۔ فراق نے کس صنفِ سخن کو اپنایا؟

(ب) درج ذیل سوالات کے تفصیلی جوابات لکھیے۔

۱۔ حسرتؔ موہانی کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجئے؟

۲۔ حسرتؔ موہانی کی صحافتی خدمات پر اظہار خیال کیجئے؟

۳۔ جگرؔ نے اردو غزل کے میدان کو کس طرح سیراب کیا؟

۴۔ جگرؔ کی حالات زندگی کا جائزہ لیجئے؟

۵۔ فراق کی ادبی خدمات پر اپنے خیالات پیش کیجئے؟

۶۔ تحریک آزادئ ہند میں فراقؔ کا کیا رول رہا واضح کیجئے؟

6.9 فرہنگ

آہنگ۔نغمہ شائستگی۔تہذیب

دقیانوسی۔قدیم۔فرسودہ اشتراکی۔سوشیلزم،سوشیلسٹ

تقویت۔طاقت مشاہدہ۔دیکھنا

تقاضا۔طلب خدوخال۔چہرہ مہرہ

معاون۔مددگار ورثہ۔وراثت کا مال

تشبیہ۔مثال دینا صنف۔علیحدہ

استعارہ۔مانگ لینا،ادھار لینا سخن۔شاعری

کنایہ۔پوشیدہ طور پر بات کرنا شاہکار۔بڑا کارنامہ

گہورہ۔جھولا تلمیذ۔شاگرد،اصلاح لینا

صعوبتیں۔تکالیف رند۔شرابی

مئے۔ شراب کسوٹی۔پرکھ،امتحان

6.10 معاون کتابیں

۱۔	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	ڈاکٹر احتشام حسین
۲۔	تاریخ اردو ادب	نورالحسن نقوی
۳۔	شعور و فن	فخر الاسلام اعظمی
۴۔	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	فخر الاسلام اعظمی
۵۔	اردو شاعری پر ایک نظر	کلیم الدین احمد
۶۔	آج کا اردو ادب	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

☆☆☆

اکائی۔ 7 : مجروح سلطان پوری، ناصر کاظمی اور معین احسن جذبی

ساخت :

7.1 اغراض ومقاصد
7.2 تمہید
7.3 مجروح، ناصر کاظمی اور جذبی کا عہد
7.4 مجروح سلطان پوری
7.4.1 مجروح سلطان پوری کی حیات وشخصیت
7.4.2 مجروح سلطان پوری کی ادبی خدمات
7.5 ناصر کاظمی
7.5.1 ناصر کاظمی کی حیات اور شخصیت
7.5.2 ناصر کاظمی کی ادبی خدمات
7.6 معین احسن جذبی
7.6.1 جذبی کی حیات وشخصیت
7.6.2 جذبی کی ادبی خدمات
7.7 خلاصہ
7.8 نمونہ امتحانی سوالات
7.9 فرہنگ
7.10 معاون کتب

7.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس لائق ہو جائیں گے کہ:

- مابعد ترقی پسند تحریک اردو غزل کے مضمرات کا تجزیہ کر سکیں۔
- مجروح، ناصر کاظمی اور جذبی کی زندگی اور حالات وکوائف کو سمجھ سکیں
- مجروح، ناصر کاظمی اور جذبی کی غزل گوئی کا جائزہ لے سکیں۔
- ان تینوں شعرا کے کلام پر اپنی آرا پیش کر سکیں۔

7.2 تمہید

اردو شاعری میں غزل ایسی صنفِ سخن ہے کہ جس میں معشوق اپنے محبوب سے ہم کلام ہوتا ہے بالخصوص وہ محبوب صنفِ نازک سے مراد ہے جس کا حسن اور عشوہ طرازیاں اسے جن کیفیات سے سرشار کرتی ہیں ان کا ذکر وہ اپنی شاعری میں کرتا ہے۔غزل شاعری کی ایک ایسی ہیئت ہے کہ جس میں عشق ومحبت کا تذکرہ ہوتا ہے اور اس کا ہر شعر جداگانہ مضمون کا حامل ہوتا ہے اس کا پہلا شعر مطلع اور آخری شعر مقطع کہلاتا ہے۔رشید احمد صدیقی غزل کو اردو شاعری کی آبرو قرار دیتے ہیں۔ان کے نزدیک ہندوستان نے اردو کے آئینے میں پہلی بار جمہوریت کی تصویر دیکھی۔غزل صنفِ سخن نہیں معیارِ سخن بھی ہے۔ان کے علاوہ دیگر اربابِ ادب بھی غزل سے متعلق تعبیرات اور تشریحات پیش کرتے ہیں جن سے اردو شاعری میں غزل کی مسلمہ اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔غزل کی ہیئت میں کہے گئے اشعار نہ صرف قاری اور سامع کو متاثر کرتے ہیں بلکہ ذہن میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ جہاں تک جدید غزل کا تعلق ہے تو اس میں حسرت، اقبال، فانی، جگر اور فراق کو ممتاز مقام حاصل ہے۔بیسویں صدی کے اوائل میں ان کی غزل گوئی نے اردو شاعری میں نئے ابعاد روشن کئے۔رشید احمد صدیقی اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

> انیسویں صدی میں غزل اور غزل گو یوں ہی سے تھا۔بیسویں صدی میں دونوں کا مقابلہ زندگی، زمانہ اور ذہن کے سیلِ بے اماں سے رہا ہے۔
>
> (بحوالہ اردو غزل از رشید احمد صدیقی، ص۔55)

7.3 مجروح، ناصر کاظمی اور جذبی کا عہد

یہ حقیقت ہے کہ ترقی پسند تحریک نے غزل کے موضوعات اور اس کی زبان اور آہنگ میں جدت طرازی کا کام انجام دیا۔اسی دور میں خارجی عوامل ،زندگی کے مادی حقائق نے اربابِ ادب اور عوام الناس کے زاویے میں تبدیلی کے عناصر اجاگر ہوئے نیز شاعری پیمانوں کو وسعت ملی ۔ترقی پسند تحریک سیاسی عوامل اور اشترا کی نظریات کی آئینہ دار تھی ۔اس سے وابستہ فن کار سیاسی اور اشترا کی نظریات کے حامل تھے۔ان پر مارکسی تصورات کا غلبہ تھا وہ ہر شے کو اسی زاویے سے پرکھتے تھے۔مجروح سلطان پوری بالخصوص ترقی پسند نقطہ نظر سے متاثر تھے مگر ان پر ترقی پسندی کے بعد جدیدیت اثرات بھی دیکھے جاسکتے ہیں تاہم وہ انفرادیت سے زیادہ اجتماعیت کی جانب مائل رہے ہیں۔ناصر کاظمی پر مابعد ترقی پسند زاویہ زیادہ حاوی رہا۔جہاں تک معین احسن جذبی کا تعلق ہے ان پر بھی ترقی پسندی کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں مگر ان کی شاعری پر دونوں نظریات کا امتزاج دیکھا جاسکتا ہے۔ترقی پسندی نے جن مسائل کی جانب توجہ دلائی تھی آزادی کے حصول کے بعد چند مسائل تو خود بخود حل ہو گئے ۔مثال کے طور پر غلامی ، جبر و استبداد اور محکومیت وغیرہ۔اس کے پہلو بہ پہلو ملک کی آزادی اور قیامِ پاکستان نے عوامی ہجرت کے سبب اربابِ دانش اور عوام الناس کی نفسیات جس حد تک متاثر ہوئی اس کی نظیر نہیں ملتی ۔مہاجرین کے دل میں پاکستان میں سکونت پذیر ہونے کے باوجود ہندوستان کے تئیں محبت کا والہانہ جذبہ تخلیق کاروں کے یہاں منعکس ہوتا رہا ہے۔جدیدیت کے حامل شعرا کے یہاں یہ کیفیت جا بجا نمایاں ہوتی رہی ہے۔

ناصر کاظمی جب بی اے کے طالب علم تھے تب ملک تقسیم ہو گیا اور اس کے بعد ہجرت کے سبب جو مسائل پیدا ہوئے انہیں انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ان کے والدین تقسیمِ ملک کی خوں ریزی اور لوٹ مار کے دوران انبالہ چھوڑ کر پاکستان آ گئے۔ان حالات نے انہیں نفسیاتی طور پر بہت متاثر کیا۔وہ سادگی اور معصومانہ طرزِ فکر کے قائل تھے مگر تقسیم کے سبب ملک گیر سطح پر رونما ہونے والے فسادات نے ان کی تمناؤں ،جذبات واحساسات کو بری طرح متاثر کیا ۔یہاں تک کہ وہ اپنے وطن کی یادوں سے کبھی باہر نہ آسکے۔انبالہ کے بارے ان کا شعر ملاحظہ ہو:

انبالہ ایک شہر تھا سنتے ہیں اب بھی ہے　　میں ہوں اسی لٹے قریے کی روشنی

ناصر کاظمی کے کلام کو ہجرت نے ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ان کے کلام میں اس درد کی کسک میں سماجی مصائب و آلام کی تصویر نظر آتی ہے۔

جہاں تک معین احسن جذبی کا سوال ہے وہ ترقی پسند تحریک کی جانب بہت ملتفت تھے۔انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام میں ان کا خاصا عمل دخل تھا لیکن ترقی پسند تحریک کے چند تصورات سے انھیں انحراف بھی تھا۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ فن کار کن نظریات کے حامل تھے؟

۲۔ مجروح سلطان پوری کے کلام پر ترقی پسندی کے بعد کس تحریک کے اثرات دکھائی دیتے ہیں؟

۳۔ ناصر کاظمی نے تقسیم ملک کے بعد کن مسائل کو دیکھا تھا؟

7.4 مجروح سلطان پوری

7.4.1 مجروح سلطان پوری کی حیات اور شخصیت

مجروح سلطان پوری کا نام اسرار حسن خاں تھا۔ وہ 1921 میں یو پی کے سلطان پور میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک ترقی پسند شاعر تھے جسے اپنے وطن سے والہانہ محبت تھی ۔ان کے والد پولس کے محکمے سے وابستہ تھے جس کے باعث ان کا معاشرے میں ایک حیثیت تھی نیز خلافت کی تحریک سے متاثر ہونے کے سبب وہ ایک خاص سیاسی زاویے کے حامل ہو گئے تھے۔ وہ مجروح کو انگریزی تعلیم سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ 1928 میں ان کا تبادلہ جب ٹانڈہ ،فیض آباد ہو گیا تو انہوں نے دینی تعلیم کی غرض سے مجروح کا داخلہ ایک مدرسے میں کروادیا مگر مدرسے کی سختیوں نے ان کے ذہن پر نہایت منفی اثر ڈالا۔ کسی ایک واقعے کے پیشِ نظر انہیں مدرسے سے نکال دیا گیا۔ بعد ازاں ان کا علمِ طب میں داخلہ ہو گیا ۔1938 میں مجروح باقاعدہ طبیب بن گئے۔ سند حاصل کرنے کے بعد انہوں نے ٹانڈہ میں اپنا مطب کھول لیا۔

خلیق انجم کے خاکے میں ان کے ابتدائی عشق سے متعلق مندرجہ ذیل اقتباس قابلِ ذکر ہے:

مجروح نے خود مجھے مسکراتے ہوئے بتایا کہ ٹانڈہ میں ایک بہت خوبصورت لڑکی سے ان کو عشق ہو گیا تھا ۔جس کا بعض لوگوں کو علم ہو گیا اس لئے وہ لڑکی کی رسوائی کے ڈر سے ٹانڈہ چھوڑ کر سلطان پور آ گئے۔

(بحوالہ: گلکاری وحشت کا شاعر، مرتبہ خلیق انجم ص۔12

اس سے ان کی شریفانہ طبیعت کا عندیہ ملتا ہے اور سماج کی تصویر بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں عشق میں رسوائی کے سبب بدنامی کے خوف سے جگہ بدلنا کسی حد تک عام تھا۔ میر تقی میر بھی ایک بار اس کیفیت سے دوچار ہوئے تھے۔ چراغ کے مجروح نمبر کے مطابق مجروح لکھنؤ کے ایک موسیقی کالج سے وابستہ ہو گئے تھے۔ انہیں بچپن سے ہی موسیقی کا شوق تھا اس لئے باقاعدہ موسیقی کی تعلیم شروع کی مگر والدین کی ناراضگی کے سبب اس شوق کو قربان کر دیا۔ مجروح نے تقریباً 1935 یا 1936 میں شاعری شروع کر دی تھی ۔مجروح کی شاعری سے متعلق

مندرجہ ذیل اقتباس نہایت اہم ہے:

مجروح کی طبیعت کو شاعری سے لگاؤ اور کافی مناسبت تھی۔سلطان پور میں ہی پہلی غزل کہی اور وہیں کے ایک آل انڈیا مشاعرے میں سنائی۔اس مشاعرے میں مولانا آسی الدنی شریک تھے۔انہوں نے اپنی ایک غزل مولانا کی خدمت میں بغرض اصلاح روانہ کی،مولانا نے مجروح کے خیالات کو باقی رکھنے اور کسی صحیح مشورے کے بجائے ان کے اشعار ہی سرے سے کاٹ دیئے اور اپنے اشعار لکھ دیئے۔مجروح نے مولانا کو لکھا کہ مقصد اصلاح یہ ہے کہ اگر قواعد یا زبان یا بحر کی کوئی لغزش ہو تو آپ مجھے اس طرف متوجہ کریں،یہ نہیں کہ اپنے اشعار کا اضافہ کر دیں۔مولانا نے جواب دیا کہ اس قسم کی اصلاح کے لئے میرے پاس وقت نہیں،چنانچہ یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

(بحوالہ: گلکاری وحشت کا شاعر: مجروح،مرتبہ خلیق انجم،ص۔12)

مجروح سلطان پوری کو زبان و بیان پر خاصی گرفت تھی۔آغازِ شاعری میں وہ جن شعراء سے متاثر تھے اور خود ان کے مطابق مجاز،جاں نثار اختر،جگر،اصغر گونڈوی او جوش وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ان کے کہے گئے جملوں سے ان کے مزاج کا عندیہ ملتا ہے۔مثال کے طور پر:

ان سے دریافت کیا گیا کہ فراق کے بعد غزل گوئی میں آپ کس شاعر کو اہم سمجھتے ہیں؟ مجروح نے جواب دیا،غزل گو شعرا میں مجھے معاف کیجئے،میں اپنے علاوہ کسی کو نہیں سمجھتا،(پاکستان کی بات نہیں کر رہا وہاں فیض بیٹھے ہوئے ہیں) پھر ایک سوال کہ جاں نثار اختر کی شاعری آپ کو کیسی لگتی ہے۔جواب دیا کہ جاں نثار اختر کی غزل کو میں دوسرے درجے کی بہت اچھی غزل کہتا ہوں۔دوسرا درجہ کہہ رہا ہوں تو میرے نزدیک انتہائی اونچی سطح مراد ہے۔

(بحوالہ مجروح سلطان پوری از وہاب اشرفی،ص۔16)

مذکورہ بالا اقتباس سے ان کی افتادِ طبع کا پتہ چلتا ہے اور یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے معاصرین کے بارے میں کیسی رائے رکھتے تھے۔علاوہ ازیں جب مجروح نے فلمی گانے لکھنے شروع کئے اس وقت ساحر نے فلمی گانوں کو ادبی

حیثیت عطا کر دی تھی مگر مجروح نے فلمی گانوں کو معیار عطا کرنے میں کوئی کثر باقی نہ رکھی۔ بقول قرۃ العین حیدر:

ہمارے ہندوستانی سنیما کو ہندی فلم کہا جاتا ہے لیکن ان کی بے پناہ مقبولیت کی ایک وجہان کے اردو مکالمے اور اردو نغمے ہی ہیں جو شکیل بدایونی ،نقش لائل پوری ،کیفی اعظمی ،علی سردار جعفری ،ساحر لدھیانوی اور مجروح سلطان پوری نے لکھے۔آپ دنیا کے کسی گوشے میں چلے جایئے جہاں ہندوستانی آباد ہیں وہاں آپ کو دور دراز کی پہاڑیوں اور گاؤں اور شہروں میں لتا کی آواز میں گائے ہوئے مجروح کے نغمے سنائی دیں گے۔آج کی سائنس اور ٹیکنالوجی کے ترقی یافتہ دور سے قبل کسی شاعر یا نغمہ نگار کو ایسی عالم گیر شہرت حاصل ہونی ممکن نہیں تھی۔

(بحوالہ گل کاری وحشت کا شاعر: مجروح ،مرتبہ خلیق انجم ،ص۔ 68)

علاوہ ازیں مجروح کے بارے میں اس امر کے بھی شواہد ملتے ہیں کہ وہ اودھ یعنی لکھنؤ کی تہذیب کے دل دادہ تھے اور بمبئی میں بھی ان کے گھر میں لکھنو کی تہذیب جھلکتی تھی۔قرۃ العین حیدر رقم طراز ہیں:

مجروح صاحب سے ممبئی کی محفلوں میں اکثر ملاقات ہوتی تھی اور وہ بہت ہی شفقت سے ملتے تھے۔ان کی بیگم فردوس بھی ایک بڑی خلیق اور ملنسار خاتون ہیں ۔میں شاعروں اور ادیبوں کی نادنوش کی محفلوں میں جانے سے احتراز کرتی ہوں لیکن مجروح صاحب کے یہاں میں کئی بار گئی کہ ان کے یہاں کا رکھ رکھاؤ قابل تعریف تھا۔ان سے آخری ملاقات دہلی میں ہوئی جب میں نے انہیں اور چند دوستوں کو اپنے یہاں مدعو کیا۔اس میں اردو بداں امریکن خاتون بھی شامل تھیں ۔انہوں نے حکمت پڑھی تھی اور عربی فارسی تو گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی ۔لیکن ممبئی میں انہوں نے خود انگریزی پڑھنی شروع کی اور انگریزی بولنے میں بھی مہارت حاصل کر لی۔

(بحوالہ ایضاً ص۔367)

مجروح سلطان پوری کو ان کی شاعری اور اردو ادب کی خدمات کے لئے غالب ایوارڈ،امتیاز میر ،یوپی اردو اکیڈمی کے انعامات کے علاوہ اردو کا اعلیٰ ترین ایوارڈ اقبال سمان دیا گیا۔اس کے علاوہ فلمی دنیا میں ان کی کاوشوں کے

اعتراف میں دادا صاحب پھالکے ایوارڈ بھی دیا گیا۔

مجروح سلطانپوری پھیپھڑوں کے عارضے میں ایک طویل عرصے سے مبتلا تھے۔ یہ تکلیف جب حد سے زیادہ بڑھ گئی تو انہیں ممبئی کے لیلاوتی اسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ یہاں 24اور 25 مئی کی درمیانی شب انہوں نے اس دارِفانی سے کوچ کیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ مجروح سلطان پوری کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

۲۔ مجروح نے کس سن میں شاعری کی؟

۳۔ مجروح سلطان پوری کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

۴۔ مجروح سلطان پوری کو ان کی شاعری اور اردو ادب کی خدمات کے لئے کن کن ایوارڈز سے نوازا گیا؟

7.4.2 مجروح سلطان پوری کی نظم نگاری

مجروح سلطان پوری کا اپنی زندگی کا ایک طویل عرصہ فلمی دنیا سے وابستہ رہا۔ انہیں فلموں سے والہانہ دلچسپی تھی۔ مجروح کو ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے مشہور و معروف ہوئے تاہم ان کی ترقی پسندی میں وہ شدت نہیں ہے جو سجاد ظہیر اور علی سردار جعفری وغیرہ کے یہاں تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ بنیادی طور پر غزل کی طرف مائل تھے۔ فارسی شاعری اور اردو کی کلاسیکی شاعری کے گہرے مطالعے نے ان کے اندر ایک نزاکت کا احساس پیدا کر دیا تھا۔ ترقی پسندی کا مزاج نظم کی طرف مائل تھا۔ ان کا خیال تھا کہ غزل زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ مجروح کے بقول:

> اسوقت ہم جس پلیٹ فارم پر آئے وہاں ہمیں شاعر تصور نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ ہم نے غزل کی صنف اپنائی تھی اور جب غزل شاعری نہیں تو ہم بھی شاعر نہیں ۔۔۔۔ میرے بارے میں تیس پینتیس سالہ شاعری پر کوئی مضمون آیا تو وہ پہلا مضمون ڈاکٹر محمد حسن نے عصری ادب میں لکھا ہے۔ جس میں مجھے میری طرح پیش کیا ہے۔

(بحوالہ مجروح سلطان پوری: مقام اور کلام، مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز، ص۔ 87)

مجروح سلطان پوری کے متعدد اشعار ایسے ہیں کہ جن میں ان کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ان کی زبان کا بانکپن انہیں دیگر شعرا سے ممتاز کر دیتا ہے۔مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

شمع بھی اجالا بھی، میں ہی اپنی محفل کا
میں ہی اپنی منزل کا، راہبر بھی راہی بھی
گنبدوں سے پلٹی ہے اپنی ہی صدا مجروح
مسجدوں میں کی میں نے جا کے دادخواہی بھی

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے کارواں بنتا گیا
دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

بقول وہاب اشرفی:

مجروح اپنی محفل کی شمع بھی ہیں اور اجالا بھی، اپنی راہ منزل کیراہبر بھی ہیں اور راہی بھی۔اگر ھنبد سے ان کی صدا پلٹتی ہے تو وہ انہیں کی صدا ہوتی ہے کسی اور کی نہیں۔ان کی منزل جو بھی ہو اس منزل کی طرف اکیلے رواں دواں تھی۔ یہ اور بات ہے کہ لوگ رفتہ رفتہ اس میں شریک ہوئے اور کارواں بنتا چلا گیا۔

(بحوالہ: مجروح سلطان پوری، از وہاب اشرفی، ص۔33)

ترقی پسند اشعار میں بعض اوقات ان کی لفظیات سے فیض کا رنگ جھلکتا ہے لیکن اس میں بھی ان کی انفرادیت نمایاں ہوتی ہے۔مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو:

حادثے اور بھی گزرے تری الفت کے سوا
ہاں مجھے دیکھ مجھے، اب مری تصویر نہ دیکھ

علاوہ ازیں انہوں نے یاسیت سے دور رہ کر امید کی کرن کی غمازی کس خوبی کے ساتھ کی ہے مثال کے طور پر یہ اشعار:

آتی ہی رہی ہے گلشن میں اب کے بھی بہار آئی ہے تو کیا
ہے یوں کہ قفس کے گوشوں سے اعلان بہاراں ہوتا تھا

اربابِ ادب کے مطابق مجروح ایسے شاعر ہیں جنہوں نے سیاسی اور سماجی مسائل کو تغزل کی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کے ہم عصر معین احسن جذبی رقم طراز ہیں:

> مجروح عشقیہ شاعری کا حق ادا نہیں کر سکے۔اس کا انہیں احساس ہے۔لیکن اس کے باوجود اس میدان میں وہ اپنے ہم عمر شاعروں میں سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ان کی اس نوع کی شاعری میں تجربات کی پختگی کے ساتھ ساتھ فکر کا کچھ عنصر شامل ہے جس کی وجہ سے ان کی رومانیت میں ایک خاص وزن وقار پیدا ہو گیا ہے۔
>
> (بحوالہ: مجروح سلطان پوری: مقام وکلام، مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز ص۔37)

اپنے مطالعے کی جانچ

ا۔ ترقی پسند اشعار میں بعض اوقات ان کی لفظیات سے کس شاعر کا رنگ جھلکتا ہے؟

۲۔ مجروح نے کن مسائل کو تغزل کی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے؟

7.5. ناصر کاظمی

7.5.1 ناصر کاظمی کی حیات اور شخصیت

ناصر کاظمی کا نام سید ناصر رضا تھا۔ان کا حسب نسب امام موسیٰ کاظم کے خاندان سے ہے جس کا سلسلہ حضرت علی ابن طالب تک پہنچتا ہے۔یہ 8 دسمبر 1925 کو محلہ قاضی واڑہ انبالہ میں پیدا ہوئے۔ناصر کاظمی کے والد تحصیل دار اور سب انسپکٹر کے علاوہ سپلائی فوج میں اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔بعد ازاں جنرل ٹائسن کے دفتر میں صوبے دار میکر کے عہدے پر فائز ہوئے۔وہ نہایت متقی پرہیز گار انسان تھے۔29 مئی 1949 کو جگر اور معدے کے عارضے کے سبب اس دنیا سے انتقال کر گئے۔ناصر کاظمی کی والدہ محمدی نے سینیر جماعت میں کامیابی حاصل کی اور مشن اسکول میں

معلمہ کی خدمت انجام دینے لگیں ۔وہ بھی ادبی مذاقِ سلیم کی حامل نہایت نیک اور رحم دل خاتون تھیں ۔26 ستمبر 1949 کوانہوں نے بھی اس دار، فانی سے کوچ کیا۔ناصر کاظمی کی ابتدائی تعلیم والدہ کے زیر،سایہ اسکول میں ہوئی۔بعد ازاں 13 سال کی عمر میں انہوں نے گلستان ، بوستان، شہ نامہ فردوسی ،قصہ چہار درویش ،فسانہٗ آزاد،صرف ونحو، الف لیلیٰ جیسی کتابوں کا مطالعہ کر لیا۔اس سے ان کے ادبی ذوق کو پختگی حاصل ہوئی ۔ناصر کاظمی پشاور کے مختلف تفریحی مقامات کی سیر کیا کرتے تھے۔وہ چڑیوں سے خاص محبت رکھتے تھے۔انہیں کبوتر پالنے کا کافی شوق تھا جوان کی زندگی کے آخری ایام تک قائم رہا۔ناصر کاظمی نے ساتویں اور آٹھویں جماعت کی تعلیم ڈی بی مڈل اسکول ڈگشائی سے حاصل کی ۔ان کی نویں اور دسویں درجات کی تعلیم انبالہ میں ہوئی۔ان کی خالہ صغریٰ بی بی ان کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''اس (ناصر) کو تجربے کرنا،سائنس کے ذریعے بجلی بنانا، ہوائی جہاز وغیرہ بنانے کا شوق تھا۔''

مزید لکھتی ہیں:

''ہم نے اس کو کبھی پڑھتے نہیں دیکھا۔اسکول جاتا تو حاضری لگواتا اور دیوار پھاند کر ناصر اور اس کا دوست افتخار بھاگ جاتے ،کبھی کسی باغ میں جا کر بیر کے درخت پر چڑھ کر امرود کھاتے۔''

ناصر کاظمی کی زندگی میں تقسیمِ ہند نے گہرے اثرات مرتب کئے۔بقول حامدی کاشمیری :

''ہجرت محض انفرادی دکھ کا نام نہ تھا، بلکہ یہ اجتماعی زندگی کی تباہی، پامالی اور درد ناکی کی داستان بھی تھی۔ناصر کاظمی کے دل و دماغ کی خواب آسودگی جو اس کے ماحول کی دین تھی ،حیوانیت اور سفاکیت کے حولناک اور لرزہ خیز واقعات کی وجہ سے درہم برہم ہوگئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔انہوں نے زندگی کا اکثر حصہ بے روزگاری، بے روزگاری ،آوارگی ،شب خیزی اور لا پرواہی میں گذارا اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ میر کی طرح نامرادانہ زیست کرتے تھے، یہاں تک کہ شب گردی اور آوا گی میں اتنی شہرت ہوگئی کہ ان کی پہچان ہو کر رہ گئی، ان کا لاابالیانہ اور بے نیازانہ طور اس بات کی توثیق کرتا ہے کہ وہ ہجرت کے بعد نئے شہر کے نئے حالات سے ذہنی موافقت پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہوئے۔''

(بحوالہ: ناصر کاظمی کی شاعری: از، حامدی کاشمیری،ص۔21)

اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے اپنے ذاتی کرب کو اجتماعی درد سے جداگانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی۔

ان کی خالہ صغریٰ بی بی کے مطابق پاکستان ہجرت کرنے کے بعد انہوں نے بڑی کسمپرسی میں زندگی بسر کی ۔یہاں تک کہ کچھ وقت والدہ کے زیور بیچ کر زندگی کی ضروریات کو پورا کیا۔ ناصر کاظمی پائلٹ بننے کے آرزومند تھے اس لئے انہوں نے R.I.A.F کا امتحان دیا۔ امتحان میں کامیابی کے باوجود طبی معائنے میں وہ کامیاب نہ ہو سکے ۔بعد ازاں انہیں ریڈیو میں ملازمت مل گئی اور اس کے پہلو بہ پہلو رسائل اوراقِ نو، ہمایوں اور خیال جیسے رسائل کے مدیر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔6 ستمبر کو خیال کی ادارت ترک کر دی اور ویلج ایڈ میں ملازمت شروع کی۔دو سال ایگری کلچرل انفارمیشن میں ٹریننگ اسپیشلسٹ کی حیثیت سے کام کیا۔22 جون 1964 کو اس ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔ بعدازاں یکم اگست 1964 کو ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ ہو گئے مگر 1971 کے بعد صحت خراب رہنے لگی۔آخرِ کار 2 مارچ 1972 کو داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

<u>اپنے مطالعے کی جانچ</u>

ا۔ ناصر کاظمی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

۲۔ ناصر کاظمی کون سی نوکری کے آرزومند تھے؟

7.5.2 ناصر کاظمی کی ادبی خدمات

نئی شاعری میں ناصر کاظمی کی شاعری نہایت اہم مقام رکھتی ہے انہوں نے شاعری کو ایک منفرد لہجہ عطا کیا۔ان کے کئی مجموعے منظرِ عام پر آئے ۔ان میں برگِ نے (1952) دیوان ناصر کاظمی (1972) پہلی بارش (1976) وغیرہ شعری مجموعے قابلِ ذکر ہیں۔ایک مجموعہ نظموں پر مشتمل بعنوان نشاطِ خواب 1977 میں منظرِ عام پر آیا۔ان کا تخلیق کردہ ایک منظوم ڈرامہ سُر کی چھایا 1981 میں شائع ہوا۔انہوں نے نظم کے بجائے غزل کا طرزِ تکلم اختیار کیا اور اسی کے توسط سے اپنی کیفیات کا اظہار کیا۔ان کی طبیعت غزل کی رمزیت ،داخلیت اور نشتریت جیسی خصوصیات کی طرف مائل تھی۔علاوہ ازیں ان کا مطالعہ زیادہ تر غزلیات پر مشتمل تھا مگر کچھ نظمیں بھی تخلیق کیں۔ان کے بقول اردو کا بہترین سرمایہ غزل ہی میں تو ہے۔حامدی کاشمیری کا یہ قول قابلِ ذکر ہے:

شاعری کوشور آفرینی کے انداز سے پاک وصاف کرنے میں راشد اور میرا جی کے فوراً بعد جس شاعر نے غیر معمولی شائستگی، ضبط اور سلیقے سے کام لیا اور اسے داخلی، شستہ اور نرم و نازک لہجے سے ہمکنار کیا وہ ناصر کاظمی ہیں۔

(بحوالہ ناصر کاظمی کی شاعری، از حامدی کاشمیری، ص۔15)

ناصر کاظمی نے مادی حقائق کو جس طرح پیش کرنے کی کوشش کی وہ طرزِ تکلم نہایت کم یاب ہے۔ان کے یہاں احساسِ شدت کو جمالیاتی فکر کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے۔بعض اوقات وہ جان کیٹس کے تصور 'حسن ابدی شے ہے' کے حامل نظر آتے ہیں۔ان کے یہاں ماضی کا درد تو ہے ہی ساتھ ہی ساتھ امید کا تصور ان کے اشعار میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔بالفاظِ دیگر رومانوی طرزِ تکلم اور اس کے تمام عناصر ناصر کاظمی کی شاعری میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ان کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

مہکی ہوئی سانس نرم گفتار
ہر ایک روش پر گل کھلائے

کچھ پھول برس پڑے زمیں پر
کچھ گیت ہوا میں لہلہائے

انصاف کا دن قریب تر ہے
پھر دادطلب ہے بے گناہی
پھر اہلِ وفا کا دور ہوگا
ٹوٹے گا طلسمِ کم نگاہی

مندرجہ بالا اشعار ناصر کاظمی کے رجائیت پسند رویے کی تصدیق کرتے ہے جس میں رومانوی تصور کی فراوانی ہے اور اس کے تحت عشقیہ انداز اور کیفیت دیکھی جا سکتی ہے۔ناصر کاظمی کی شاعری میں نسوانی حسن کی کشش اور لطافت میں ہوس پرستی کے بجائے حسیاتی لطافت پائی جاتی ہے۔اس میں معصومانہ اظہار پاکیزگی کے ساتھ اجاگر ہوتا ہے۔وہ ان احساسات کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہیں۔مثال کے طور پر ان کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

چاند کی دھیمی دھیمی ضو میں   سانولا مکھڑا لو دیتا ہے

اک رخسار پہ زلف گری تھی　　　　　اک رخسار پہ چاند کھلا تھا

تیرے بالوں کی خوشبو سے　　　　　سارا آنگن مہک رہا تھا

اسی طرح چند اشعار:

بسا ہوا ہے خیالوں میں کوئی پیکرِ ناز
بلا رہی ہے ابھی تک وہی دل نشیں آواز
وہی دلوں میں تپش ہے وہی شبوں میں گداز
مگر یہ کیا کہ مری زندگی میں سوز نہ ساز

ان کی شاعری میں ہندوستانی موسموں کا تذکرہ اور محبوب کی یاد بہت خوبصورت انداز میں پیش کی گئی ہے۔ان کے یہاں ہندی زبان کے الفاظ اسی مناسبت سے منظرکشی کرتے ہیں۔ یہ طرزِ بیان ان کے اصل ہندوستانی رنگ کا غماز ہے جس میں درد کی کسک کا لطیف احساس بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔مثال کے طور پر یہ اشعار:

پھر ساون کی پون چلی تم یاد آئے
پھر پتوں کی پازیب بجی تم یاد آئے

تقسیمِ ہند کے دوران جو فسادات ہوئے اور شہروں کے ساتھ ساتھ عوامی ملکیت کو جلایا گیا اس کا کرب ناصر کاظمی کی شاعری میں جابجا جھلکتا ہے۔مثال کے طور پر:

شہر در شہر گھر جلائے گئے
یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے
اک طرف جھوم کر بہار آئی
اک طرف آشیاں جلائے گئے

کیا کہوں کس طرح سرِ بازار
عصمتوں کے دیے بجھائے گئے

وقت کے ساتھ ہم بھی اے ناصرؔ

خار وخس کی طرح بہائے گئے

ان اشعار میں ملک کی تقسیم کے سبب پیدا ہونے والے نامساعد حالات کا کرب جا بجا دکھائی دیتا ہے۔ تقسیم ہند بیسویں صدی کا ایک ایسا المیہ رہا ہے کہ اس نے ہندو پاک کے عوام کو معاشی، سیاسی اور سماجی سطح پر جو درد اور زخم دیا کہ اس کے اثرات کئی نسلوں تک نہ صرف باقی رہے بلکہ آج بھی عوام کے دل میں اس کرب کو دیکھا سکتا ہے۔ اسی طرح وطن کی یاد ان کے کلام میں محسوس دیکھی جا سکتی ہے جا سکتی ہے مثال کے طور پر:

پیارے دیس کی پیاری مٹی　　　　سونے پر ہے بھاری مٹی

وہ اپنے بچپن کے سماجی اور معاشعری ماحول کے ساتھ ساتھ موسموں کے رنگوں کو اپنی شاعری میں سموتے ہیں:

او پچھلی رات کے ساتھی　　　　اب کے برس میں تنہا ہوں

تیری گلی میں سارا دن　　　　دکھ کے کنکر چنتا ہوں

اسی طرح یہ اشعار وطن کی یاد کو پیش کرتے ہیں:

ہم جس پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھا کرتے تھے

اب اس پیڑ کے پتے جھڑتے جاتے ہیں

وہ اپنے احباب کو جس طرح یاد کرتے ہیں اس سے ان کے درد کی شدت کو محسوس کیا جا سکتا ہے:

جنہیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصر　　　　وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں

آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں　　　　یادوں کے بجھے ہوئے سویرے

یہی بجھے ہوئے سویرے انہیں اداس کر دیتے ہیں۔ اقبال کے یہاں کھوئے ہوؤں کی جستجو جس طرح نظر آتی تھی اس کی ایک جھلک ناصر کاظمی کی شاعری میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ناصر کاظمی کے یہاں خوف وہراس کی کیفیت جا بجا دیکھی جا سکتی ہے۔ مثال :

ہر ذرہ ایک محمل عبرت ہے دشت کا

آنکھ جھپکوں تو شرارے برسیں

ناصر کاظمی کے یہاں پیکر تراشی کی نہایت عمدہ مثالیں ملتی ہیں ۔بصری پیکر کے تحت شکل رنگ اورحرکت سے متعلق خصوصیات کی تصویر واضح ہوجاتی ہے۔مثال کے طور پر:

سوچتا ہوں کہ سنگ منزل نے چاندنی کا لباس کیوں پہنا

رنگ کھلے صحرا کی دھوپ
زلف گھنے جنگل کی رات

دکھ کی لہر نے چھیڑا ہوگا
یاد نے کنکر پھیرا ہوگا

سمعی پیکر کے تحت شعری کلام کا وہ تصور جو قوت سماعت کو اپنی طرف مائل کرتا ہے۔مثال کے طور پر:

دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

شمومی پیکر کا تصور قوتِ شامہ کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔مثال کے طور پر:

مٹی کی خوشبو لینے
نیل گگن سے اترے پھول

مذوقی پیکر کے تحت شعر کا وہ تصور جو ذائقے سے تعلق رکھتا ہے۔مثال کے طور پر:

کسی بے نام وہم کی دیمک
چاٹنے آ گئی لہو میرا

اس طرح ناصر کاظمی کے یہاں آفاقی محبت ،رومانوی معصومانہ خلوص،انسانی دردمندی،پیکر تراشی اورعصری آگہی کی مثالیں بخوبی دیکھی جاسکتی ہیں جو ترقی پسندی کے بعد نئی جہت کی عکاسی کرتی ہیں ۔حامدی کاشمیری اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

تقسیم کے بعد 1955 کے آس پاس شعری مزاج کو جس گہری اور نتیجہ خیز تبدیلی سے دوچار ہونا پڑا، اس کے لئے ناصر کاظمی نے زمین ہموار کی تھی۔اس لحاظ سے انہیں جدیدیت کا پیش رو قرار دینے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے۔

(بحوالہ: ناصر کاظمی کی شاعری، از حامدی کاشمیری، ص۔56)

مذکورہ مباحث کی روشنی میں ناصر کاظمی کو اربابِ ادب نے جدید جدید شاعری کا موجد قرار دیا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

ا۔ ناصر کاظمی کے منظوم ڈرامے کا نام لکھیے؟

۲۔ ناصر کاظم کے پہلے مجموعۂ کلام کا کیا نام ہے؟

۳۔ ناصر کاظمی جان کیٹس کے کس تصور کے حامل نظر آتے ہیں؟

7.6 معین احسن جذبی

7.6.1 معین احسن جذبی کی حیات وشخصیت

معین احسن جذبی 1912 کو قصبہ مبارک پور اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ان کے اجداد کا تعلق میرٹھ کے معزز تعلیم یافتہ خان دان سے تھا۔ان کے پر دادا مولوی حمزہ علی وہاں کے جید عالم تھے اور ان کے والد یعنی لکڑ دادا فوج میں صبے دار کے عہدے پر فائز تھے۔جذبی کی ابتدائی تعلیم جھانسی میں ہوئی اور وہاں سے انہوں نے ہائی اسکول کیا امتحان میں کامیابی حاصل کی۔جھانسی میں انہیں حامد شاہ جہاں پوری کی صحبت حاصل ہوئی جہاں مقامی شعرا اکثر وبیشتر آیا کرتے تھے۔یہاں مشاعرے منعقد ہوتے تھے جس میں طلبا دیگر شعرا کی نظمیں پڑھ کر سناتے تھے۔ان میں جذبی اپنی دل نشیں آواز میں کلام سناتے تھے۔وہ اپنے استاد قاضی خورشید احمد سے شعر کی باریکیوں پر گفتگو کرتے تھے۔اسی دوران جذبی کو حامد شاہ جہاں پوری کی بیاض مل گئی انہوں نے اسے یاد کرلیا اور ان کی زمین میں متعدد اشعار کہہ ڈالے۔ان سے دورانِ ملاقات شعر کی نزاکتوں پر گفتگو کرتے تھے۔اس طرح بچپن میں ہی ان کے شعری ذوق میں نکھار پیدا ہوا۔1929 میں معین احسن جذبی نے ہائی اسکول میں کامیابی حاصل کی اور آگرہ کا رُخ کیا وہاں انہوں نے سینٹ جانس

کالج میں ایف اسی ایس سی کی تعلیم حاصل کی ۔1929 تا 1931 ان کا قیام آگرہ میں رہا اور انہوں نے ایف ایس سی میں کامیابی حاصل کی ۔اس وقت فانی بدایونی آگرہ میں رہتے تھے اور وہاں ان کا خاصا دبدبہ تھا۔ایک دن اپنے دوست اور مجاز کے بھائی انصار ہروانی کے کے ساتھ وہ فانی سے ملاقات کے لئے گئے ۔وہاں ان سے تعارفی گفتگو ہوئی ۔فانی نے ان کے شعری ذوق سے متعلق سوال کیا اور جذبی سے ان کے اشعار سننے کی فرمائش کی۔جذبی نے اپنے کہے گئے چند اشعار ان کے سامنے پیش کئے۔مثال کے طور پر:

دل کو ہونا تھا جستجو میں خراب
پاس تھی یوں تو منزلِ مقصود

غم کی تصویر بن گیا ہوں میں
خاطرِ درد آشنا ہوں میں

فانی بدایونی نے ان کی غزلیں بغور سنیں اور اس مصرع میں اصلاح کی:

پاس تھی یوں تو منزلِ مقصود

انہوں نے اس مصرع میں یوں کی جگہ ورنہ کر کے مصرع پڑھا:

پاس تھی ورنہ منزلِ مقصود

جذبی کے مطابق پھر فانی اپنی آرام کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ ملال صاحب! اب تک جتنے شاعر قسم کے طالب علم آئے ان میں سے ہر ایک سے میں نے یہ کہا کہ آپ شاعری کی حالت پر رحم کریں لیکن ااپ کے اشعار سن کر میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اس خلشِ دل کو نہ چھوڑیں۔

(بحوالہ: جذبی شناسی از مشتاق صدف،ص۔25)

اس طرح فانی بدایوں کے ان حوصلہ افزا کلمات سے ان کی شعری ذوق کو بری تسکین حاصل ہوئی ۔بعد ازاں ان کی میکش اکبرآبادی سے کسی مشاعرے میں بھی ملاقات ہوئی۔جذبی فانی کی شاعری اور شخصیت دونوں سے بے حد متاثر ہوئے ۔انہوں نے انہیں ہمیشہ اپنا ہمدرد پایا۔شروع میں جذبی کا تخلص ملال تھا بعد میں جذبی ہوا۔

1933 میں جذبی حصولِ تعلیم کے لئے لکھنو آ گئے اور کرسچین کالج میں داخلہ لے لیا۔بعد ازاں 1934 میں جذبی دہلی چلے گئے اور پھر انہوں نے 1936 میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔اس کے بعد روزگار کے سلسلے میں بمبئی اور

بھوپال میں قیام پذیر رہے۔ 1941 میں جذبی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایم اے میں داخلہ لے لیا۔ ایم اے کرنے کے بعد دہلی چلے آئے اور رسالہ آج کل میں میں نائب مدیر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ 1945 میں جذبی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لکچرر ہو گئے۔ درس و تدریس کے دوران انہوں نے پی ایچ ڈی میں داخلہ لے لیا اور مقالہ بعنوان حالی کا سیاسی شعور قلم بند کیا۔ یہ مقالہ 1959 میں احباب پبلشرز لکھنو نے شائع کیا یہ کتاب جذبی کی تنقیدی بصیرت کی غماز ہے۔ اسی اثنیٰ میں وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ 1943 میں ان کا شعری مجموعہ فروزاں شائع ہوا۔ پھر سخن مختصر شائع ہوا۔ ان کا تیسرا مجموعہ کلام گداز شب 1985 میں مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی سے شائع ہوا۔ جذبی کی زندگی کے بارے میں مشہور صحافی اور ادیب انور عظیم رقم طراز ہیں:

> جذبی کو پچھلی زندگی اور یونیورسٹی کی زندگی میں بڑے صدمے اٹھانے پڑے ہیں۔ ہر شاخ گل جس کی طرف شاعر کا ہاتھ بڑھا۔ کانٹوں کی بیل میں بدل گئی ہے۔ وہ بچہ جو ساڑھے تین سال کی عمر میں اپنی ماں کو کھو بیٹھا، جس کی تعلیمی زندگی میں برابر ٹھوکریں لگتی رہیں۔ جس کے باپ نے کم عمری میں اپنا ہاتھ اس کے سر سے اٹھا لیا۔ جس نے مختلف ملازمتیں کیں اور ہر جگہ حکام سے ٹکر ہوئی، جسے فلمی دنیا میں ضمیر اور آزادی کے خیال نے کچھ کرنے نہ دیا، جس نے اپنی ساری زندگی افلاس، نیم فاقہ کشی، ناامیدی اور شکستوں کے اندھیرے میں بتائی، جس نے صبح نشاط سے شامِ غم تک کی منزلیں طے کیں۔

(بحوالہ نقوش، شخصیات نمبر، اکتوبر 1954، ص۔ 1151)

اس طرح معین احسن جذبی کی تمام زندگی مصائب و آلام کا شکار رہی مگر اپنے اخلاقی اصولوں سے انہوں نے کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ یہ عوامل ان کی ادبی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ جذبی نے اپنے شعری مجموعہ 'فروزاں' کے دیباچے میں شاعری سے متعلق نظریات اس طرح پیش کئے ہیں:

> ہمارے لئے مارکسی نقطہ نظر پیدا کرنا نہایت ضروری ہے۔ اگر ہم اپنے آپ کو واقعی ترقی پسندی کا علم بردار کہتے ہیں لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ مارکس کے نظریات کو رنگین یا پرشوکت الفاظ میں نظم کر دیا جائے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے ہمارے لئے جو چیز زیادہ اہم ہے وہ زندگی یا زندگی کے تجربات ہیں۔ لیکن کوئی تجربہ اس وقت تک موضوعِ سخن نہیں بن سکتا۔ جب تک اس میں شاعر کو جذبہ کی

شدت اور احساس کی تازگی کا احساس نہ ہو جائے۔

(بحوالہ: فروزاں، دوسرا اڈیشن، 1951، چند باتیں، ص۔5)

مذکورہ اقتباس کی روشنی میں جذبی کے شعری نظریات منکشف ہو جاتے ہیں نیز ان کے مزاج کی کیفیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے جس نے ان کی نثر اور نظم دونوں کی فنی بنیادوں کو استحکام بخشا۔ حالانکہ انہیں اتنی مقبولیت نہیں ملی جس کے وہ مستحق تھے تاہم ان کی شاعری ان کے ہم عصر شعرا میں ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ 13 فروری 2005 کو معین احسن جذبی خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

ا۔ معین احسن جذبی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

۲۔ آگرہ میں کس مشہور شاعر نے جذبی کے شعری ذوق کو پرکھا؟

۳۔ فانی نے جذبی کے کس مصرع کیا اصلاح کی؟

۴۔ جذبی کا انتقال کب ہوا؟

7.6.2 جذبی کی ادبی خدمات

اردو ادب میں معین احسن جذبی کی ادبی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا گو ابتدا میں وہ ترقی تحریک سے وابستہ رہے مگر اس میں انتہا پسند رویے کو انہوں نے سخت نا پسند کیا اور نہایت متوازن زاویہ نگاہ کو اختیار کیا۔ ان کی مندرجہ تصانیف ہیں:

- فروزاں (شعری مجموعہ)
- سخنِ مختصر (شعری مجموعہ)
- گدازِ شب (اس میں دو شعری مجموعوں کا منتخب کلام بھی شامل ہے)
- حالی کا سیاسی شعور (نثری تصنیف)
- طلسمِ ہوش ربا (نامکمل، غیر مطبوعہ)
- خودنوشت سوانح، کہتا ہوں سچ کہ۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ

معین احسن جذبی عہدِ حاضر کے ان شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں جو نہایت حقیقت پسند روش پر کاربند رہے ہیں

۔انہیں بنیادی طور پر غزل کا شاعر تسلیم کیا جا تا ہے مگر انہوں نے نظمیں بھی کہی ہیں ۔ان کی غزلوں میں رومانوی طرزِ تکلم جا بجا نظر آتا ہے تاہم معروضیت کی خصوصیت ان کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہے ۔اربابِ ادب اور ناقدین ان کے موزوں الفاظ سلاست اور روانی کے معترف رہے ہیں ۔1929 تا 1983 کی 77 غزلیں، 28 نظمیں اور دو رباعیوں پر مشتمل مجموعہ 'گداز شب' شائع ہوا۔اس کے علاوہ کلیاتِ جذبی کی بھی اشاعت ہو چکی ہے ۔گدازِ شب کی ابتدا ان ہی کے شعر سے ہوتی ہے اس میں انہوں نے اپنا تعارف بھی پیش کیا ہے۔شعر ملاحظہ ہو:

چمن کی نذر ہیں یہ پارہ ہائے قلب وجگر
یہ پھول وہ ہیں کہ شاید کبھی نہ مرجھائیں

گداز شب میں شامل چار اشعار پر مشتمل پہلی غزل سے ان کے نظریات کا عندیہ ملتا ہے

غم کی تصویر بن گیا ہوں میں
خاطرِ درد آشنا ہوں میں

ضبطِ غم بے سبب نہیں جذبی
خلشِ دل بڑھا رہا ہوں میں

ان کے ابتدائی کلام پر فانی جگر اور اصغر کے اثرات کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے ۔ان کی شاعری بالخصوص غزلوں میں جہاں حسن کی جلوہ طرازیاں موجود ہیں م ساتھ ہی انفرادی غم اور حصولِ منزل کی جدو جہد بھی دیکھی کا سکتی ہے مثال کے طور پر:

طلسمِ راہِ الفت اور فریبِ شوق ارے توبہ
ابھی تو مدتوں بھٹکیں گے منزلیں دیکھنے والے

شکوہ کیا کرتا کہ اس محفل میں کچھ ایسے بھی تھے
عمر بھر جو اپنے زخموں پر نمک چھڑکا گئے

اپنی ہستی کی حقیقت کیا میں دنیا پھونک دوں
کاش مل جائے وہ سوزِ غم جو پروانوں میں ہے

اس طرح ان کے کلام میں انفرادی کرب بخوبی دیکھا جا سکتا ہے ۔ان کی شاعری میں جہاں محبت کی عکاسی ہوتی

ہے ساتھ ہی سنجیدگی اور متانت بھی پر اثر انداز میں جلوہ گر ہوتی ہے۔جذبی کم گو شاعر رہے ہیں مگر اس کم گوئی میں فکر انگیزی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اس بات کا اعتراف وہ کسی انٹرویو میں اس طرح کرتے ہیں؛

''میں ہر سال اپنی بیاض اٹھاتا تھا اور اس میں سے کچھ نہ کچھ کاٹ دیا کرتا تھا۔یہ ٹھیک نہیں ہے۔''

(بحوالہ کتاب نما اکتوبر 1990،شمارہ 10،ص۔111)

جذبی کا کلام عوام وخواص دونوں میں پسند کیا جاتا تھا۔1933 کے مشاعرے میں مندرجہ ذیل غزل نے بڑی دادو تحسین حاصل کی تھی۔اس کے اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

ایک بن گیا فرزانہ، ایک ہوگیا سودائی
تھا جتنا جو ظرف اس میں اتنی ہی شراب آئی

اظہارِ محبت پر اس طرح وہ شرمائے
سب ان کی حیا میری آنکھوں میں اتر آئی

کچھ دل کی محبت میں مٹنے کا خیال آیا
کچھ تیرے تغافل نے کی حوصلہ افزائی

کیفیتِ ہجراں کی معراج ہے اے جذبی
محفل میں نظر آئے جب عالمِ تنہائی

جذبی کی غزل میں شدتِ احساس کی فراوانی اور غنائیت کی خصوصیت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔یہ غزل حسرت اور جگر کے طرزِ تکلم کی ہم نوا معلوم ہوتی ہے۔اس سے ان کے شعور کی بالیدگی کا عندیہ ملتا ہے۔1933 کی ایک اور مشہور غزل کے اشعار:

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا،اب خواہشِ دنیا کون کرے

جب کشتی ثابت وسالم تھی،ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

جو آگ لگائی تھی تم نے، اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے، اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے
دنیا نے ہمیں چھوڑا جذبی، ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دنیا کو
دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں، اب دنیا دنیا کون کرے

اس طرح ان کے کلام سے ان کی ذاتی زندگی کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ ان کی غزل پر فانی کا اثر نماں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ پروفیسر محمد حسن جذبی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> جذبی سلگتی ہوئی آتش رفتہ کے شاعر ہیں۔ ان کے پہلے دور کی شاعری میں بھی فانی اور جگر کا ایک لطیف امتزاج ہے، جو عشق ار فن دونوں کو لذت نہیں، ریاض دیتا ہے۔ وہ ستاروں پر کمندیں ڈالنے والے شاعر نہیں، زندگی کو بھوگنے اور بھگتنے والے دردمند شاعر ہیں۔

(بحوالہ معاصر ادب کے پیش رو از محمد حسن، ص۔60)

جذبی نے نظمیں بھی لکھی ہیں ان کی نظموں کی رومانی فضا اور تشبیہات اور استعارات قابلِ دید ہیں ان میں کیف و مستی بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک نظم گل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے گل نازک ادا، اے خندۂ صبح چمن
چومتی ہے تیرے ہونٹوں کو نسیم، مشکِ تن
گھیر لیں جیسے عروسِ نو کو ہم سن لڑکیاں
یوں تجھے گھیرے ہوئے ہیں نونہالانِ چمن

تو زمینِ رنگ و بو، تو آسمانِ رنگ و بو
مختصر یہ ہے کہ تو ہے اک جہانِ رنگ و بو

اس طرح کی نظمیں اقبال کے یہاں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ الغرض جذبی کی غزلیہ اور نظمیہ شاعری معانی اور مفاہیم کے ساتھ ساتھ فنی لوازمات کو جس طرح پیش کرتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اربابِ ادب کے علاوہ عوام و خواص میں جذبی کا کلام قدر کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ معین احسن جذبی کی نثری تصنیف کا نام لکھیے۔

۲۔ مجموعہ 'گداز شب' میں جذبی کی کتنی غزلیں، نظمیں اور رباعیاں شامل ہیں؟

7.7 خلاصہ

یہ حقیقت ہے کہ ترقی پسند تحریک نے غزل کے موضوعات اور اس کی زبان اور آہنگ میں جدت طرازی کا کام انجام دیا۔ اسی دور میں خارجی عوامل، زندگی کے مادی حقائق نے اربابِ ادب اور عوام الناس کے زاویے میں تبدیلی کے عناصر اجاگر ہوئے نیز شاعری پیمانوں کو وسعت ملی۔ ترقی پسند تحریک سیاسی عوامل اور اشترا کی نظریات کی آئینہ دار تھی ۔اس سے وابستہ فن کار سیاسی اور اشترا کی نظریات کے حامل تھے۔ ان پر مارکسی تصورات کا غلبہ تھا وہ ہر شے کو اسی زاویے سے پرکھتے تھے۔ مجروح سلطان پوری بالخصوص ترقی پسند نقطہ نظر سے متاثر تھے مگر ان پر ترقی پسندی کے بعد جدیدیت اثرات بھی دیکھے جا سکتے ہیں تاہم وہ انفرادیت سے زیادہ اجتماعیت کی جانب مائل رہے ہیں۔ ناصر کاظمی پر مابعد ترقی پسند زاویہ زیادہ حاوی رہا۔ جہاں تک معین احسن جذبی کا تعلق ہے ان پر بھی ترقی پسندی کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں مگر ان کی شاعری پر دونوں نظریات کا امتزاج دیکھا جا سکتا ہے۔ ترقی پسندی نے جن مسائل کی جانب توجہ دلائی تھی آزادی کے حصول کے بعد چند مسائل تو خود بخود حل ہو گئے۔ مثال کے طور پر غلامی، جبر و استبداد اور محکومیت وغیرہ۔ اس کے پہلو بہ پہلو ملک کی آزادی اور قیامِ پاکستان نے عوامی ہجرت کے سبب اربابِ دانش اور عوام الناس کی نفسیات جس حد تک متاثر ہوئی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مہاجرین کے دل میں پاکستان میں سکونت پذیر ہونے کے باوجود ہندوستان کے تئیں محبت کا والہانہ جذبہ تخلیق کاروں کے یہاں منعکس ہوتا رہا ہے۔ جدیدیت کے حامل شعرا کے یہاں یہ کیفیت جا بجا نمایاں ہوتی رہی ہے۔

مجروح سلطان پوری کا اپنی زندگی کا ایک طویل عرصہ فلمی دنیا سے وابستہ رہا۔ انہیں فلموں سے والہانہ دلچسپی تھی ۔مجروح کو ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے مشہور و معروف ہوئے تاہم ان کی ترقی پسندی میں وہ شدت نہیں ہے جو سجاد ظہیر اور علی سردار جعفری وغیرہ کے یہاں تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ بنیادی طور پر غزل کی طرف مائل تھے ۔فارسی شاعری اور اردو کی کلاسیکی شاعری کے گہرے مطالعے نے ان کے اندر ایک نزاکت کا احساس پیدا کر دیا تھا۔ ترقی پسندی کا مزاج نظم کی طرف مائل تھا۔ ان کا خیال تھا کہ غزل زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔

نئی شاعری میں ناصر کاظمی کی شاعری نہایت اہم مقام رکھتی ہے انہوں نے شاعری کو ایک منفرد لہجہ عطا کیا۔ ان کے کئی

مجموعے منظرِ عام پر آئے۔ان میں برگِ نے (1952) دیوان ناصر کاظمی (1972) پہلی بارش (1976) وغیرہ شعری مجموعے قابلِ ذکر ہیں۔ایک مجموعہ نظموں پر مشتمل بعنوان نشاطِ خواب 1977 میں منظرِ عام پر آیا۔ان کا تخلیق کردہ ایک منظوم ڈرامہ سُر کی چھایا 1981 میں شائع ہوا۔

انہوں نے نظم کے بجائے غزل کا طرزِ تکلم اختیار کیا اور اسی کے توسط سے اپنی کیفیات کا اظہار کیا۔ان کی طبیعت غزل کی رمزیت ،داخلیت اور نشتریت جیسی خصوصیات کی طرف مائل تھی۔علاوہ ازیں ان کا مطالعہ زیادہ تر غزلیات پر مشتمل تھا مگر کچھ نظمیں بھی تخلیق کیں۔ان کے بقول اردو کا بہترین سرمایہ غزل ہی میں تو ہے۔

ناصر کاظمی نے مادی حقائق کو جس طرح پیش کرنے کی کوشش کی وہ طرزِ تکلم نہایت کم یاب ہے۔ان کے یہاں احساسِ شدت کو جمالیاتی فکر کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے۔بعض اوقات وہ جان کیٹس کے تصورحسن ابدی شے ہے کے حامل نظر آتے ہیں۔ان کے یہاں ماضی کا درد تو ہے ہی ساتھ ہی ساتھ امید کا تصوران کے اشعار میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔بالفاظِ دیگر رومانوی طرزِ تکلم اور اس کے تمام عناصر ناصر کاظمی کی شاعری میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

معین احسن جذبی عہدِ حاضر کے ان شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں جو نہایت حقیقت پسند روش پر کاربند رہے ہیں۔انہیں بنیادی طور پر غزل کا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے مگر انہوں نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ان کی غزلوں میں رومانوی طرزِ تکلم جابجا نظر آتا ہے تاہم معروضیت کی خصوصیت ان کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہے۔اربابِ ادب اور ناقدین ان کے موزوں الفاظ سلاست اور روانی کے معترف رہے ہیں۔1929 تا 1983 کی 77 غزلیں ،28 نظمیں اور دو رباعیوں پر مشتمل مجموعہ گداز شب شائع ہوا۔اس کے علاوہ کلیاتِ جذبی کی بھی اشاعت ہوچکی ہے۔گدازِ شب کی ابتدا ان ہی کے شعر سے ہوتی ہے اس میں انہوں نے اپنا تعارف بھی پیش کیا ہے۔جذبی کی غزل میں شدتِ احساس کی فراوانی ہیا ورغنائیت کی خصوصیت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔یہ غزل حسرت اور جگر کے طرزِ تکلم کی ہم نوا معلوم ہوتی ہے۔اس سے ان کے شعور کی بالیدگی کا عندیہ ملتا ہے۔جذبی نے نظمیں بھی لکھی ہیں ان کی نظموں کی رومانی فضا اور تشبیہات اور استعارات قابلِ دید ہیں ان میں کیف و مستی بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔

7.8 نمونہ امتحانی سوالات

(الف) درج ذیل سوالوں کے مختصر جوابات لکھیے۔

۱۔ مجروح، ناصر، جذبی کے دور کی چند خصوصیات لکھئے۔

۲۔ ترقی پسند شاعری میں مجروح، ناصر اور جذبی کی کیا اہمیت ہے؟

۳۔ مجروح، ناصر اور جذبی کی شاعری کی چند مثالیں لکھئے۔

۴۔ ناصر کاظمی کی شاعری کو متاثر کرنے والے حالات کی نشاندہی کیجئے۔

(ب) درج ذیل سوالوں کے تفصیلی جوابات لکھیے۔

۱۔ مجروح، ناصر اور جذبی کی شاعری کے امتیازات لکھئے۔

۲۔ مجروح سلطان پوری کی ترقی پسندی کی چند مثالیں لکھئے۔

۳۔ ناصر کاظمی کی شاعری کی خصوصیات لکھئے۔

۴۔ جذبی کی شاعرانہ خوبیوں پر روشنی ڈالئے۔

7.9 فرہنگ

جبر واستبداد	ظلم، زبردستی
تغزل	شاعرانہ خصوصیت، عشقیہ مضامین بیان کرنا
ابدی	کبھی نہ ختم ہونے والا
عروس	دلہن
امتزاج	آمیزش، ہم آہنگی
افلاس	غریبی
جمالیات	حسن شناسی
مادی	طبعی

7.10 معاون کتابیں

1۔ مجروح سلطان پوری مقام اور کلام از ڈاکٹر محمد فیروز
2۔ گل کاری وحشت کا شاعر مجروح مرتبہ خلیق انجم
3 ۔ جذبی شناسی، از مشتاق صدف
4۔ جذبی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ از نسرین رئیس خاں
5۔ ناصر کاظمی کی شاعری از حامدی کاشمیری
6۔ ناصر کاظمی کی ڈائری مرتبہ از حسن سلطان کاظمی
7۔ کتاب نما اکتوبر 1990 مرتبہ اڈیٹر مکتبہ جامعہ لیمیٹیڈ، دہلی
8۔ ناصر کاظمی کی شاعری میں پیکر تراشی از ثمیہ تمکین

☆☆☆

اکائی ۔8 : مرزا سلامت علی دبیرؔ، جگت موہن لال رواںؔ

ساخت :

8.1 اغراض ومقاصد

8.2 تمہید

8.3 رباعی

8.4 مرزا سلامت علی دبیرؔ : حیات اورادبی خدمات

8.5 جگت موہن لال رواں : حیات اورادبی خدمات

8.6 خلاصہ

8.7 نمونۂ امتحانی سعالات

8.8 فرہنگ

8.9 معاون کتابیں

8.1 اغراض ومقاصد

ایف وائے بی اے میں اردو زبان وادب کو بطور لازمی مضمون پڑھنے والے طلبہ کے لیے ضروری ہے کہ انھیں اردو شاعری کی تمام اصناف سے واقف کرایا جائے۔ اصنافِ شاعری سے طلبہ کی یہ واقفیت محض سرسری نہ رہے بلکہ وہ ہر صنفِ سخن کے فنی لوازم اور اس کی مختصر تاریخ سے آشنا ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ان کے سامنے کم از کم دو شعرا کا کلام بطور عملی نمونہ پیش کیا جائے تا کہ اس صنفِ سخن میں انھیں دل چسپی پیدا ہو اور انھیں اضافی مطالعے کی تحریک ملے۔

'رباعی کا فن' کی تدریس کے ذریعے درج ذیل اہداف حاصل کیے جا سکتے ہیں:

ا۔ طلبہ کو اردو شاعری کی اہم صنف 'رباعی' کے مبادیات اور عناصرِ ترکیبی سے روشناس کرانا۔

۲۔ 'رباعی' سے متعلق تمام اصطلاحات کو مثالوں کے ساتھ اس طرح واضح کرنا کہ طلبہ دیگر اصنافِ سخن سے اس کا موازنہ کر سکیں۔

۳۔ ’رباعی‘ کی مقبولیت کے اسباب سے طلبہ کو واقف کرانا۔
۴۔ تفہیمِ رباعی میں طلبہ کی مدد کرنا۔

8.2 تمہید

اردو کے اصنافِ سخن میں ’رباعی‘ ایک چھوٹی اور اہم صنف دیگر بہت سی اصنافِ سخن کی طرح اردو میں فارسی کے راستے سے داخل ہوئی ہے۔ اصطلاحاً اس سے وہ شعری ہیئت مراد ہے جو چار مصرعوں پر مبنی ہو۔ ہر زمانے کے شاعروں نے اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ مرزا سلامت علی دبیر اور جگت موہن لال رواںؔ کو اردو رُباعی کی تاریخ میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ مرزا دبیرؔ نے مرثیہ گوئی کے علاوہ سلام، رباعیات اور قطعات نگاری میں بھی نام پیدا کیا ہے جب کہ رواں نے رباعی گوئی کو اپنا شعار بنایا۔

8.3 رباعی

اردو کے اصنافِ سخن میں ’رباعی‘ ایک چھوٹی لیکن اہم صنف ہے۔ یہ عام طور پر فلسفیانہ، اخلاقی، تفکیری اور کبھی کبھی عشقیہ مضامین پر مبنی ہوتی ہے۔ دیگر بہت سی اصنافِ سخن کی طرح رباعی بھی اردو میں فارسی کے راستے سے داخل ہوئی ہے۔ اردو زبان کے تمام ابتدائی شعرا فارسی زبان وادب سے واقف تھے اور وہ فارسی میں مشقِ سخن کیا کرتے تھے۔ جب زبانِ اردو کو ادب نواز حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تو اُن فارسی گو شعرا نے اردو میں بھی طبع آزمائی کرنا شروع کی۔ اس زمانے میں فارسی کی تمام مروّجہ اصناف، اردو کے قالب میں ڈھلنے لگیں۔ غزل، قصیدہ، مثنوی ، قطعہ، واسوخت، شہر آشوب اور رباعی جیسے اسالیبِ سخن اپنی مکمل ہیئت اور روایتی مضامین کے ساتھ اردو میں جگہ بنانے لگے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان تمام اصنافِ سخن کی پشت پر فارسی شاعری کی پختہ روایتیں موجود ہیں۔

معنی ومفہوم :

رباعی اردو شاعری کی مقبول صنف ہے۔ اس سے متعلق عام معلومات کا خلاصہ یہ ہے:

ا۔ رباعی چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ (غلط فہمی کی وجہ سے بعض قارئین انھیں دو منفرد اشعار بھی سمجھ لیتے ہیں۔) ۲۔ اس کے پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعے میں ردیف وقوافی کا التزام ہوتا ہے۔

۳۔ اس کا تیسرا مصرع بے قافیہ و بے ردیف ہوتا ہے۔

۴۔ اس کا چوتھا مصرع بہت زوردار ہوتا ہے جس میں نہ صرف خیال کی تکمیل ہوتی ہے بلکہ اسی کی بنیاد پر 'رباعی' کی قدر متعین ہوتی ہے۔

۵۔ رباعی کہنا آسان ہے کیوں کہ غزل کے شعر کے مقابلے میں، جہاں صرف دو مصرعوں میں بات مکمل کرنے کی پابندی ہوتی ہے، رباعی کے چار مصرعے زیادہ گنجائش اور سہولت فراہم کرتے ہیں اور شاعر اپنے مضمون کو قدرے وضاحت سے پیش کر سکتا ہے۔

فنی خصوصیات:

رباعی' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں: ''چار چار''۔ اصطلاحاً اس سے وہ شعری ہیئت مراد ہے جو چار مصرعوں پر مبنی ہو اور فکر و خیال کے لحاظ سے مکمل ہو۔ رباعی کے چار مصرعوں میں خیال مربوط اور مسلسل ہوتا ہے اور آخری مصرعے میں خیال کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس کے پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور تیسرا بے قافیہ۔ لیکن تیسرے مصرعے میں بھی قافیے کی مثالیں ملتی ہیں اور اسے کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا بلکہ بعض ناقدین نے اسے مستحسن قرار دیا ہے۔ رباعی مردّف بھی ہو سکتی ہے اور غیر مردّف بھی، البتہ یہ ضروری ہے کہ تمام مصرعے 'بحرِ ہزج' کے اُن اوزان کی پابندی کرتے ہوں جو رباعی کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں۔ رباعی کے لیے بحرِ ہزج سے تسکینِ اوسط کے عمل کے ذریعے چوبیس اوزان حاصل کیے گئے ہیں۔ تکنیکی لحاظ سے رباعی انھیں چوبیس اوزان میں سے کسی ایک یا زیادہ سے زیادہ چار اوزان میں کہی جا سکتی ہے۔ مطلب یہ کہ چاروں مصرعوں کا ایک ہی وزن پر ہونا ضروری نہیں بلکہ چاروں مصرعے چار مختلف اوزان میں ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ ایسا بہت کم ہوتا ہے اور بیش تر رباعیاں کسی ایک ہی وزن میں کہی گئی ہیں۔ رباعی کے معروف اوزان میں سے ایک 'لاحول ولا قوۃ الّا باللہ' بھی ہے۔

تاریخی پس منظر اور اہم رباعی گو شعرا:

اردو شاعری کی تاریخ کے ہر عہد میں 'رباعی' ایک مقبولِ عام صنف رہی اور ہر زمانے کے شاعروں نے اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا اور مفیدِ مطلب سمجھتے ہوئے اس میں طبع آزمائی کی۔ دکن میں محمد قلی قطب شاہ، ملّا اسد اللہ وجہیؔ اور غوّاصیؔ کو پہلے دور کے رباعی گو شعرا کہا جا سکتا ہے۔ عادل شاہی دور میں نصرتیؔ قابلِ ذکر رباعی گو شاعر رہے۔ اسی طرح ولیؔ دکنی اور شاہ سراجؔ اورنگ آبادی نے بھی اس صنف میں فکر و فن کے پھول کھلائے ہیں۔ ان شاعروں نے مذہبی،

عارفانہ، عشقیہ، فلسفیانہ، اخلاقی غرض ہر طرح کے مضامین کو اپنی رباعیوں میں برتا ہے۔ شمالی ہند میں دورِ قدیم اور دورِ متوسطین ومتاخرین کے بے شمار شاعروں نے اس صنفِ سخن کی آب یاری کی۔ حاتمؔ، امینؔ، بیدارؔ وغیرہ نے ابتدائی دور میں رباعیاں کہیں۔ میر تقی میرؔ، مرزا محمد رفیع سوداؔ، خواجہ میر دردؔ، میر سوزؔ، میر حسنؔ اور قائمؔ چاند پوری وغیرہ نے بھی 'رباعی' کو بڑی سنجیدگی سے برتا اور اس میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور فکری جولانیوں کو پیش کیا۔ ان کے بعد انشاء اللہ خان انشاؔ، غلام ہمدانی مصحفیؔ، رنگینؔ، خلیقؔ وغیرہ نے پرانے موضوعات کے علاوہ اپنی جدّتِ طبع سے طنزیہ، ہجویہ، ذاتی اور سماجی رباعیاں کہیں۔ شعرائے متوسطین میں ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، ناسخؔ، آتشؔ، وغیرہ نے، جو کہ میدانِ غزل کے شہ سوار تھے، رباعی کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اسے بڑی سنجیدگی سے برتا۔ لکھنو میں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے اگر چہ مرثیے کو بامِ عروج پر پہنچایا لیکن دونوں نے اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین کے ساتھ بڑی تعداد میں رثائی رباعیاں کہی ہیں۔ محفلوں میں مرثیہ خوانی سے پہلے انیسؔ و دبیرؔ اور دیگر شعرا رثائی رباعیوں سے آغاز کیا کرتے تھے۔ نئے دور میں حالیؔ، اکبرؔ، اسمٰعیل میرٹھی جیسے ممتاز شعرا نے عمدہ رباعیاں کہہ کر رباعی کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔ اُن کے علاوہ شادؔ عظیم آبادی، امیرؔ مینائی، داغؔ دہلوی، نظم طباطبائی، ریاضؔ خیر آبادی، عزیزؔ لکھنوی، شوقؔ قدوائی وغیرہ نے بھی رباعی کے میدان میں بھرپور جوہر دکھائے ہیں۔ بیسویں صدی کے وسط میں رباعی کو مزید مقبولیت حاصل ہوئی اور جوشؔ ملیح آبادی، یاسؔ یگانہؔ چنگیزی، امجدؔ حیدرآبادی، فراقؔ گورکھپوری، جگرؔ مرادآبادی، فانیؔ بدایونی، اصغرؔ گونڈوی اور حسرتؔ موہانی جیسے شعرا نے رباعی گوئی پر سنجیدگی سے توجّہ دی۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ 'رباعی' کسے کہتے ہیں؟

۲۔ رباعی کی بحر سے متعلق اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

۳۔ اردو رباعی کے عام موضوعات پر روشنی ڈالیے۔

۴۔ اردو کے اہم رباعی گو شعرا کی فہرست بنایئے۔

8.4 مرزا سلامت علی دبیرؔ کی حیات اور ادبی خدمات

اردو مرثیہ نگاری کو فکری وفنی عروج پر پہنچانے اور اسے اردو کی قابلِ فخر صنف بنانے میں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے کارناموں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں کے شاعرانہ کمالات کو جلا بخشنے اور پروان چڑھانے میں لکھنو کے ادبی و مذہبی ماحول نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ مرزا سلامت علی دبیرؔ اصلاً ایرانی نژاد تھے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ ملّا ہاشم شیرازی،

ایران کے مستند شاعر ملّا اہلی شیرازی (مصنف مثنوی سحرِ ہلال) کے حقیقی بھائی تھے۔مرزا دبیرؔ 29 اگست 1803ء کو دہلی کے بلی ماراں میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام مرزا غلام حسین تھا۔مرزا صاحب سات سال کی عمر میں والد کے ہم راہ لکھنؤ آئے۔سولہ برس کی عمر میں علوم عربی وفارسی میں خاصی مہارت پیدا کر لی تھی۔انھیں مولوی غلام ضامن نے صرف ونحو،ادب، منطق اور حکمت وغیرہ سے آراستہ کیا اور مولوی مرزا محمد کاظم علی نے کتب دینیہ، حدیث وتفسیر اور اصولِ حدیث و فقہ کی تعلیم دی۔علمِ عروض وعلم بلاغت کی تعلیم بھی مولوی غلام ضامن سے حاصل کی تھی۔ان کے علاوہ ملّا مہدی اور مولوی فدا علی سے بھی تحصیلِ علم کیا تھا۔مرزا صاحب کو بچپن سے مرثیہ گوئی کا شوق تھا۔تقریباً بارہ سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا اور مشہور مرثیہ گو مظفر حسین ضمیرؔ کی شاگردی اختیار کر لی۔استاد ہی نے 'دبیر' تخلص سے سرفراز کیا تھا۔تقریباً دس برسوں تک استاد کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔مشق اور فطری صلاحیتوں نے اس مقام پر پہنچایا کہ استاد بھی فخر کرنے لگے۔جب میر انیسؔ فیض آباد سے لکھنؤ آئے تو دونوں میں دوستی ہوگئی۔مرزا صاحب 1857ء تک لکھنؤ سے باہر نہیں نکلے۔البتہ 1858ء میں مرشد آباد اور 1859ء میں پٹنہ عظیم آباد گئے تھے۔نواب واجد علی شاہ کی خواہش پر کلکتہ بھی گئے اور مٹیا برج میں مہمان ہوئے۔1874ء میں ضعفِ بصارت کی شکایت ہوئی۔مرزا دبیرؔ کو آخری عمر میں مرنے سے قبل چند صدمے اٹھانے پڑے۔اُن کے جوان بیٹے مرزا محمد ہادی عطاردؔ کا 20 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔دبیر نے فارسی کلام میں عطارد تخلص استعمال کیا۔دوسرا صدمہ بڑے بھائی مرزا غلام محمد نظیر کے مرنے کا ہوا۔تیسرا صدمہ ان دونوں سے بڑھ کر ہوا کہ 29 شوال 1874 کو میر انیس کی وفات ہوئی۔واقعہ اس طرح ہے کہ مرزا دبیرؔ ایک مرثیہ نظم کر رہے تھے کہ میر انیسؔ کے انتقال کی خبر ملی۔مرثیہ ناتمام چھوڑ دیا اور کہا "دبیر یہ تیرا آخری مرثیہ ہے" اور یہی نامکمل مرثیہ اپنی آخری مجلس میں پڑھا۔7 مارچ 1875 کو لکھنؤ میں وفات پائی اور اپنے مکان میں دفن ہوئے۔

مرزا دبیرؔ نے مرثیہ گوئی کے علاوہ سلام، رباعیات اور قطعات نگاری میں بھی نام پیدا کیا ہے۔اُن کے کلام کا خاص جوہر زورِ بیان، شوکتِ الفاظ، بلندیِ تخیل اور صنائع کا استعمال ہے۔وہ تشبیہات واستعارات کو بھی بہت سلیقے اور تخلیقی ذہانت سے استعمال کرتے ہیں جس سے کلام میں عجب لُطف پیدا ہوتا ہے۔رباعی نگار کے لیے تسلسلِ بیان، الفاظ وتراکیب کا موضوع اور برمحل استعمال کا خیال رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔رباعی کا فن سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا فن ہے۔مرزا صاحب اس نکتے سے بخوبی واقف تھے۔'اردو رباعیات' کے مصنف سلام سندیلوی نے مرزا دبیرؔ کی رباعیات کو مختلف زُمروں مثلاً مذہبی، اخلاقی، فلسفیانہ، سماجی اور ذاتی وغیرہ میں تقسیم کر کے اُن کی خصوصیات کو اُجاگر کیا ہے۔اُن کے تجزیے سے پتا چلتا ہے کہ مرزا صاحب نے اس صنف کو واقعی بہت سنجیدگی سے برتا ہے۔انھوں نے حمدیہ، نعتیہ اور رثائی رباعیوں میں ایمانی پختگی، اللہ اور رسول کی محبت اور اپنے مذہبی معتقدات کو پیش کیا ہے۔اخلاقی رباعیات

میں کہیں عجز و انکسار اور خلوص کی تلقین کی ہے اور کہیں ریا اور عیب جوئی کی مذمت کو موضوع بنایا ہے۔ان کی فلسفیانہ رباعیوں میں زندگی کی حقیقت و ماہیت پرغور وخوض ملتا ہے۔ بے ثباتیِ دنیا اور چندروزہ عیش ونشاط کی حقیقت کو اکثر رباعی گوشعرا نے موضوع بنایا ہےلیکن اس ضمن میں مرزا صاحب کی رباعیاں بہت منفرد اور یادگار ہیں۔ان کی سماجی رباعیات غدر کے بعد کے سماجی انتشار اور شرفا کی پراگندہ حالی کو پیش کرتی ہیں۔مرزا صاحب نے بعض رباعیوں میں اپنے ذاتی احوال وکوائف اور شاعرانہ خود ستائی کو بھی جگہ دی ہے۔غرض اردو رباعی کی تاریخ میں مرزا سلامت علی دبیرؔ کی رباعیاں کمیت وکیفیت کے اعتبار سے قابلِ ذکر مقام رکھتی ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ مرزا سلامت علی دبیرؔ کی تعلیم اور آغازِ شاعری پر روشنی ڈالیے۔

۲۔ اخیر عمر میں مرزا دبیرؔ کو کون سے صدمے اٹھانے پڑے؟

۳۔ مرزا دبیرؔ کی رباعیات کے اہم موضوعات کیا ہیں؟

8.5 جگت موہن لال رواںؔ کی حیات وادبی خدمات

جگت موہن لال رواںؔ کو اردو رُباعی کی تاریخ میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔انھوں نے بطور رباعی گو شاعر اپنی شناخت مستحکم کی ہے۔جس وقت انھوں نے رباعی گوئی کو اپنا شعار بنایا، اردو میں حالیؔ اور اکبرؔ کی اخلاقی رباعیاں گونج رہی تھیں۔ایسے میں انھوں نے فلسفیانہ موضوعات کو نظم کر کے اپنی الگ راہ نکالی اور اتنے کام یاب ہوئے کہ اب اردو رباعی کی تاریخ اُن کے ذکر کے بغیر نامکمل کہلائے گی۔انھیں اپنی زندگی ہی میں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی تھی اور ان کے معاصرین نے ان کے کلام کی پختگی کا اعتراف کر لیا تھا۔سلام سندیلوی اپنے تحقیقی مقالے ’اردو رباعیات‘ میں رقم طراز ہیں:

> ”رواںؔ کی رباعیات میں خیالات کی بلندی، بندش کی چستی، طرزِ ادا کی جدّت، نازک تشبیہات اور حسین استعارات موجود ہیں۔ان کی رباعیات میں ایک خاص قسم کی روانی اور ترنّم بھی موجود ہیاور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کی رباعیات کا خاص موضوع فلسفہ ہےلیکن فلسفے کی آمیزش نے اُن کی رباعیات کو دقیق، خشک اور بے آب ورنگ نہیں بنایا بلکہ حسن وخوبی میں اور اضافہ کیا ہے۔ان کی فلسفیانہ اور حکیمانہ رباعیات کا انداز وہی ہے جو عمر خیام کا ہے۔“

رواںؔ کی ولادت 14 جنوری 1889ء کو اُتر پردیش میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام چودھری مُنشی گنگا پرشاد تھا۔ نو سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ بڑے بھائی کنہیالال کی سرپرستی میں تعلیم حاصل کی۔ گریجویشن کے بعد ایم۔ اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں اور وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ انھیں بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا، خاندان کے سبھی لوگ علم وادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے، اس لیے گھر کے ماحول نے شوق میں جلا پیدا کی اور تعلیم کے ساتھ شاعری کا شغل جاری رہا۔ انھوں نے 1904ء میں عزیزؔ لکھنوی کی شاگردی اختیار کی۔ مثنوی اور رباعی کو میدان بنایا۔ فلسفے کے طالبِ علم تھے اسی لیے زندگی کے حقائق کو سمجھنے سمجھانے میں دلچسپی پیدا ہوتی گئی اور اسی موضوع نے شاعری میں جگہ پائی۔ رواںؔ کے کلام کا مجموعہ "روحِ رواں" کے نام سے پہلی مرتبہ 1928ء میں شائع ہوا جس میں ان کی نظمیں، قطعات۔ غزلیں اور رباعیات شامل ہیں۔ انھوں نے بہت کم عمری میں خاصی شہرت پائی۔ رواںؔ کا انتقال 1934ء میں صرف پنتالیس سال کی عمر میں ہوا۔

جگت موہن لال رواںؔ نے اپنی رباعیات میں تقریباً تمام اہم شعری موضوعات کو برتا ہے لیکن فلسفیانہ موضوعات سے انھیں خاص شغف تھا اسی لیے کمیت وکیفیت کے اعتبار سے ان رباعیوں نے ناقدین کو زیادہ متاثر کیا ہے۔ انھوں نے زندگی اور موت کے فلسفے پر مختلف پہلوؤں سے غور وخوض کیا ہے۔ وہ بے ثباتیِ دنیا کا اعتراف تو کرتے ہیں لیکن ان پر مقصدِ زندگی کا راز نہیں کھُلتا اور یہ سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ اس کائنات کی تخلیق کیوں کی گئی ہے۔ وہ موت کو ایک انقلاب سمجھتے ہیں اور تخریبِ حیات میں تعمیرِ حیات کی تلاش کرتے ہیں لیکن تدبیرِ حیات پر اُن کا یقین کچھ لڑکھڑا جاتا ہے۔ رواںؔ نے فلسفۂ جبر واختیار، فلسفۂ گناہ اور اسی طرح فلسفۂ فنا و بقا کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ان کی عارفانہ رباعیاں بھی دلوں میں سوز وگداز پیدا کرنے والی ہیں۔ انھوں نے بڑی تعداد میں اخلاقی اور اصلاحی رباعیاں بھی کہی ہیں۔ رواںؔ کے موضوعات میں تنوّع ہے۔ ان کی رباعیات میں عشقیہ اور خمریہ موضوعات بھی ملتے ہیں اور قدرت کے حسین مناظر بھی جلوہ گر ہوتے ہیں، وہ اپنی رباعیوں میں سماجی مسائل بھی اُٹھاتے ہیں اور فرد اور جماعت کے تعلق پر گفتگو کرتے ہیں تو دوسری طرف اپنے ذاتی احوال وکوائف بھی نظم کرتے ہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ میں کم ہی ایسے شعرا ہیں جنھوں نے صرف صنف رباعی کے ذریعے اپنی شناخت قائم کی۔ امجدؔ حیدرآبادی کے بعد جگت موہن لال رواںؔ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ جب بھی اردو میں 'رباعی' پر بات ہوتی ہے، ان کا نام لیے بغیر گفتگو مکمل نہیں ہوتی۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ جگت موہن لال رواں نے کس فلسفے پر مختلف پہلوؤں سے غور وخوض کیا ہے؟

۲۔ رواںؔ کے کلام کا مجموعہ "روحِ رواں" کے نام سے پہلی مرتبہ کب شائع ہوا؟

۳۔ جگت موہن لال رواں کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

8.6 خلاصہ

'رباعی' اردو شاعری کی ایک مقبولِ عام صنف ہے۔ یہ چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اور اپنی مخصوص فنی شناخت رکھتی ہے۔ اس کے لیے بحرِ ہزج کے چوبیس اوزان مخصوص کیے گئے ہیں۔ اردو شاعری کے ہر دور میں شعرا نے اس صنف کو مفیدِ مطلب پایا اور اس کی پذیرائی کی۔ اس میں ہر قسم کے فلسفیانہ، عاشقانہ، رندانہ، مذہبی، تاریخی اور نجی موضوعات کو بہت خوب صورتی سے نظم کیا گیا۔ مرزا سلامت علی دبیرؔ اور جگت موہن لال رواںؔ نے اپنے علم وتجربے کی پختگی اور شاعرانہ بصیرت سے صنف 'رباعی' کو مزید اعتبار بخشا ہے۔

8.7 نمونۂ امتحانی سوالات

(الف) مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

۱۔ جگت موہن لال رواںؔ کی رباعیات سے متعلق سلام سندیلوی کے خیالات کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۲۔ رواںؔ کے حالاتِ زندگی کو مختصراً بیان کیجیے۔

۳۔ رواںؔ کی رباعیات میں فلسفیانہ موضوع کی اہمیت پر تبصرہ کیجیے۔

(ب) مندرجہ ذیل سوالات کے تفصیلی جوابات لکھیے۔

۱۔ فنِ رباعی پر تفصیلی مضمون لکھیے۔

۲۔ مرزا سلامت علی دبیرؔ کی رباعی گوئی کا احاطہ کیجیے۔

۳۔ جگت موہن لال رواںؔ کی رباعیات کے موضوعات کو تفصیل سے لکھیے۔

8.8 فرہنگ

مشقِ سخن

مردف	نظم،غزل یا عبارت،جس میں ردیف پائی جاتی ہو۔
دقیق	دشوار

8.9 معاون کتابیں

اردو رباعی : فنی و تاریخی ارتقا فرمان فتح پوری

رباعیات رواں

مرزا دبیر نمبر مصطفی حسن رضوی

☆☆☆

نصاب

(حصہ دوم)

<u>حصۂ نثر :</u>

۱۔ گلشن امید کی بہار	مولانا محمد حسین آزاد	(انشائیہ)
۲۔ پورا آدمی ادھورا خاکہ	یوسف ناظم	(خاکہ)
۳۔ ناٹک	مشتاق احمد یوسفی	(طنز ومزاح)
۴۔ کارمن	قر العین حیدر	(افسانہ)
۵۔ یہ لندن ہے	سید احتشام حسین	(سفرنامہ)
۶۔ منزل ہے کہاں تیری	پروفیسر مسز نور العین علی	(ڈراما)

<u>حصۂ نظم :</u>

(الف) غزلیات :

۱۔ حسرت موہانی
۲۔ جگر مرادآبادی
۳۔ فراق گورکھپوری
۴۔ مجروح سلطان پوری
۵۔ ناصر کاظمی
۶۔ معین احسن جذبی

(ب) نظمیں :

۱۔ کتے	فیض احمد فیض
۲۔ حویلی	مخدوم محی الدین
۳۔ عمر گریزاں کے نام	اختر الایمان
۴۔ مرے عہد کے حسینو!	ساحر لدھیانوی
۵۔ اجنتا	سکندر علی وجد
۶۔ زندگی سے ڈرتے ہو	ن۔م۔راشد

(ج) رباعیات :

۱۔ جگت موہن لال رواں
۲۔ مرزا دبیر

☆☆☆

مولانا محمد حسین آزاد

گلشن امید کی بہار

انسان کی طبیعت کو خدا نے انواع واقسام کی کیفیتیں عطا کی ہیں۔مگر زمین جس قدر تخم امید کو پرورش کرتی ہے اس کثرت سے کسی کیفیت کو سرسبز نہیں کرتی اور کیفیتیں خاص خاص وقت پر اپنا اثر کر اٹھتی ہیں یا بمقتضائے سن خاص خاص عمروں میں ان کے اثر ظاہر ہوتے ہیں۔مگر امید کا یہ حال ہے کہ جس وقت سے اس بات کی تمیز ہونے لگی کہ حالت موجودہ ہماری کچھ خوش حال یا بدحال بھی ہوسکتی ہے اسی وقت سے اسکی تاثیر شروع ہوجاتی ہے۔امید ایک رفیق ہمدم ہے کہ ہر حال اور ہر زمانے میں ہمارے دم کے ساتھ رہتا ہے، دم بدم دلوں کو بڑھاتا ہے اور سینے کو پھیلاتا ہے، خیالات کو وسعت دیتا ہے اور نئی نئی کامیابوں کی ترغیبیں دیتا ہے۔غرض ہمیشہ کسی نہ کسی خوش حالی کا باغ پیش نظر رکھتا ہے کہ یا اس سے کوئی کلفت رفع ہو یا کچھ فرحت زیادہ ہو۔خدا کی نعمتیں اور ساری خوش نصیبی کی دولتیں حاصل ہوجائیں پھر بھی یہ جادو نگار مصور ایک نہ ایک ایسی تصویر سامنے کھینچ دیتا ہے، جسے دیکھ کر یہی خیال آتا ہے کہ بس یہ بات ہوجائے گی تو ساری ہوسیں پوری ہوجائیں گی اور سب آرزوؤں سے جی سیر ہوجائے گا۔اس میں بھی شک نہیں کہ امید ہونا ہر حالت میں ضرور ہے۔وہ ضروری شے ہے کہ دنیا کی بہتر سے بہتر حالت میں بھی ہم کو اس ضرورت سے بے نیاز نہیں کرسکتی، کیوں کہ حقیقت میں یہ مشغلے زندگی کے بہلاوے ہیں۔اگر ان کا سہارا ہمارا دل نہ بڑھاتا رہے تو ایک دم گزارنا مشکل ہوجائے اور زندگی وبال معلوم ہونے لگے۔

ایک دم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا ناگورا
پر امیدِ وصل پر برسوں گوارا ہوگیا

اس میں شک نہیں کہ امید دھوکے بہت دیتی ہے اور ان باتوں کی توقع پیدا کردیتی ہے جو انسان کو حاصل نہیں ہوسکتیں، مگر وہ دھوکے کے اصلی نعمتوں سے سوا مزہ دیتے ہیں اور موہوم وعدے قسمت کی لکھی ہوئی دولتوں سے گراں بہار اور خوش نما معلوم ہوتے ہیں۔اگر کسی معاملے میں ناکام بھی ہوتی ہے تو اسے ناکامی نہیں کہتی بلکہ قسمت کی دیر کہہ کر ایک اس سے بھی اعلا یقین سامنے حاضر کردیتی ہے۔میں ایک رات انھیں خیالات میں حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ انسان کے دل میں یہ شوق کہاں سے پیدا ہوجاتا ہے جس سے اپنے تئیں آپ دھوکے دیتا ہے اور زمانہ آیند پر رنگ آمیزیاں چڑھا کر

خود اپنے لیے امید وبیم اور نفع ونقصان کے سامان تیار کر لیتا ہے یکا یک آنکھ لگ گئی، دیکھتا ہوں کہ میں ایک باغ نو بہار میں ہوں، جس کی وسعت کی انتہا نہیں۔ امید کے پھیلاؤ کا کیا ٹھکانا ہے۔ آس پاس سے لے کر جہاں تک نظر کام کرتی ہے تمام عالم رنگین وشاداب ہے۔ ہر چمن رنگ وروپ کی دھوپ سے چمکتا، خوشبو سے مہکتا ہوا سے لہکتا نظر آتا ہے۔ زمین فصلِ بہار کی طرح گلہائے گونا گوں سے بوقلموں ہو رہی ہے اور رنگ رنگ کے جانور درختوں پر چہچہے بھر رہے ہیں۔ یہ سماں بہار کا دیکھ کر دل پر عالم طاری ہوا کہ سرتا پا محو ہو گیا۔ جب ذرا ہوش آیا تو ان چمن ہائے دل کشا کہ تھوڑی دور آگے رنگیلے چمکیلے پھول کھلے ہیں، آب زلال کے چشمے دھوپ کی چمک سے جھل جھمل کر رہے ہیں۔ اونچے اونچے درخت جھنڈ کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں، جو جانور دھیمی آواز سے بولتے سنائی دیتے تھے، یہاں خوب زور شور سے چہکار رہے ہیں، چاروں طرف ہرے ہرے درخت لہلہاتے ہیں اور آگے بڑھنے کو للچایا چنانچہ قدم اٹھایا مگر جوں جوں آگے بڑھتا گیا زیادہ حیران ہوتا گیا کیوں کہ جو ہریاولی سامنے سے لہلہاتی دکھائی دیتی تھی پاس پہنچ کر اس کی رنگت پھیکی پڑ گئی اور میوے تو گر ہی چکے تھے۔ بلبلیں جو چہچہے بھر رہی تھیں وہ آگے آگے اڑتی چلی جاتی تھیں، اگر چہ میں بہت پھرتی سے پہنچا تھا۔ اور جو بہاریں تھیں وہ ہر قدم پر سامنے ہی تھیں مگر تو بھی ہاتھ نہ آسکیں، گویا میرے شوق آرزو کو ڈہکاتی تھیں کہ جوں جوں میں آگے بڑھتا تھا وہ اور بھی آگے بڑھتی جاتی تھیں۔

اگر چہ بار بار خوش اور دم بدم غمگین ہوتے ہوتے میں دق ہو گیا مگر دل کے کان میں کوئی یہی کہے جاتا تھا کہ چلتے چلو، جو نعمتیں ڈہکا رہی ہیں، کبھی نہ کبھی ہاتھ آئیں گی۔ آخر چلتے چلتے ایک جمگھٹا نظر آیا جس میں زن ومرد، خورد وکلاں بہت سے آدمی اچھلتے چلے جاتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کسی مجلس یا میلے میں جاتے ہیں یا کسی نشاط عام کے جشن میں شامل ہوتے ہیں کیونکہ ہر ایک کے منہ پر یقین کا رنگ چمک رہا تھا اور ایک ایک آنکھ سرمۂ شوق سے روشن نظر آتی تھی، ساتھ ہی یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہر کی خوشی کچھ ایک خاص قسم کی ہے کہ وہ اس کے دل میں ہے۔ سب ملے جلے ساتھ ہی چلے جاتے تھے مگر نہ کوئی اپنا ارادہ دوسرے کو بتانا چاہتا تھا نہ اپنے فکر کا راز دوسرے کو جتانا گوارا کرتا تھا۔ بہت لوگوں کی گرمی رفتار سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر کوئی آرزو مند شوق کی پیاس سے تڑپتا ہو تو انھیں اس کے بجھانے کی بھی فرصت نہیں۔ اس واسطے ان کے روکنے کو جی نہ چاہا اور تھوڑی دیر تک غور سے دیکھتا گیا۔ آخر ایک بڈھا نظر آیا کہ باوجود بڑھاپے کے ان ہیں میں شامل تھا۔ ہاتھ پانو بہت مارتا تھا مگر کچھ ہو نہ سکتا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ بوڑھے کو اب کیا ہوس ہوگی اسے شاید کچھ جواب دینے کی فرصت ہو، چنانچہ اسے سلام کیا۔ بوڑھے نے تیوری بدل کر منہ پھیر لیا اور کہا، ''صاحب دِق نہ کیجیے، آپ جانتے بھی ہیں؟ جس وقت کی کہ ہم عمروں سے آرزو کر رہے تھے وہ وقت آن پہنچا ہے۔ اب ایک عہد آیا ہے کہ تمام عالم فراغ البالی سے مالا مال ہو جائے گا۔ افلاس زدہ اور طالب روزگار بے چارے ٹیکس محصول کے مارے آئے دن

کی جاں کنی سے خلاص ہوجائیں گے، بلکہ فلک کے سیمرغ جو اہل عالم کے کاروبار میں رات دن سیر گرداں ہیں ، وہ بھی بازوڈال آرام سے بیٹھ جائیں گے۔'' میں نے بوڑھے کو اس کی خشکی دماغ کے حوالے کیا، اور وہیں ٹھہر گیا۔ اتنے میں ایک شخص سامنے آیا جس کی ملائمت شکل اور آہنگی رفتار سے معلوم ہوا کہ شاید کچھ اخلاق سے پیش آئے ،مگر جب میں اس کی طرف بڑھا تو اس نے جھک کر ایک سلام کیا اور کہا، ''اگر آپ کی خدمت کی فرصت ہوتی تو میں بہت خوش ہوتا مگر اب اس خوشی کا ہوش نہیں کیونکہ بیس برس سے میں ایک عہدے کی امیدواری کر رہا تھا، اب وہ خالی ہوا چاہتا ہے۔''

میں نے اسے بھی چھوڑ اور ایک اور کو جالیا۔ وہ گھبرایا ہوا جاتا تھا کہ چچا کی میراث پر قبضہ کر لے کیونکہ اس کی بیماری کی خبر سننے میں آئی تھی۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص دیکھا کہ بے تحاشا بھاگا چلا آتا تھا۔ اس نے ایک غوطہ خوری کی کل ایجاد کی تھی اس کے دریائے منافع میں غوطہ مارا چاہتا تھا یعنی اگر کچھ اور نہ ہو تو ایجاد کا نعام ہی ہاتھ آجائے۔

ایک شخص کو دیکھا کہ تھوڑی دور چلتا ہے اور ٹھہر جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ طول بلد اور عرض بلد کے خیالات پھیلا رہا ہے اور سرکارِ عالم سے انعام کا امیدوار ہے۔

جب جابجا سے ٹکریں کھائیں تو یہ سوچا کہ اوروں سے دریافت کرنا بے حاصل ہے، اب جو اپنی آنکھ کہے وہ ٹھیک ہے ۔آگے بڑھو اور آپ دیکھو، کہ اتنے میں ایک نوجوان شوقین بے پرواسا نظر آیا اور آزادی کے عالم میں مسکراتا چلا جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر دل میں کہا کہ بھلا ایک دفعہ تو اسے بھی ٹٹولنا چاہیے۔ چنانچہ معمولی سوال کا سبق اسے بھی سنایا۔ وہ ہنسا اور کہا، صاحب جہاں آپ کھڑے ہیں، یہ ملکہ امید کا باغ ہے، وہ ملکہ آرزو کی بیٹی ہے۔ ذرا سامنے دیکھو بہت سی پریاں خوشنما اور نفیس نفیس چیزیں لیے کھڑی ہیں۔ جن لوگوں کو تم نے زوروشور مچاتے دیکھا۔ یہ ان ہی کے اشاروں پر للچاتے ہوئے دوڑے جاتے ہیں۔ آنکھ اٹھا کر دیکھو تو فی الحقیقت سامنے ایک ایوان عالی شان ہے اور اس کے صدر میں ایک پری جس کا گلزار جوانی عین بہار پر ہے، سرتخت جلوہ گر ہے۔ مسکراہٹ اس کے زیرِ لب پارہ کی طرح لوٹتی ہے، لعل وجواہر تاج مرصع موتیوں کے ہار، خلعت زرنگار کشتیوں میں چنے ہوئے آگے دھرے ہیں۔ قسمت اور نصیب جہاں کی نعمتیں سجائے اس کے دائیں بائیں دست بستہ حاضر ہیں ۔اور بہار زندگی کے پھولوں کا فرش سامنے بچھا ہے۔ عیش مدام اور فرحت دوام سے چہرہ روشن ہے۔ اس کے لبوں کی مسکراہٹ اور آنکھ کی لگاوٹ عام سے خاص تک برابر سب کی حق شناسی کر رہی ہے۔ اس سے ہر شخص یہی سمجھ رہا ہے کہ ملکہ میری ہی طرف متوجہ ہے اور اسی بھروسے پر ہر ایک فخر اور ناز کے مارے پھولا نہیں سماتا۔ رستے کے دونوں طرف کہیں کہیں ایک آدھ جھونپڑی نظر آتی تھی۔ وہ دیکھنے میں پست اور بے حقیقت تھی مگر ہرے درختوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ دیواریں لپی ہوئی ہوئیں م دروازے پر روشن حرفوں میں لکھا تھا ' قناعت کا آرام گھر' بعضے تھکے ماندے ان میں چلے آتے اور پانو پھیلا کر بیٹھ جاتے۔ راستے والے دیکھ دیکھ کر غل مچاتے کہ بھاگ گئے اور ہمت کے میدان ہار گئے۔

☆☆☆

یوسف ناظم

پورا آدمی ادھورا خاکہ

راجندر سنگھ بیدی نے آج سے کوئی آٹھ سال پہلے ایک مضمون لکھا تھا، ہاتھ ہمارے قلم ہوئے۔ اس ۸ سال کے عرصے کے میں ان پر کیا بیتی اور کیا نہیں بیتی، اس کا علم شاید انھیں خود بھی نہ ہو، پھر ہم لوگ کس گنتی میں ہیں (یوں جب بھی ہمیں گنا جاتا ہے ہم پہلے سے ۶،۴ کروڑ زیادہ ہی ہو جاتے ہیں)۔ ان کے ہاتھ قلم تو نہیں ہوئے لیکن بے قلم ضرور ہو گئے۔ بیدی صاحب اتنے ہیمار رہے ہیں، اتنے بیمار رہتے ہیں جیسے انھوں نے کسی سے کہہ رکھا ہو، لاؤ، سب کی طرف سے میں بیمار ہو لیتا ہوں۔ وہ اپنی کہانیوں کے عنوان بھی کچھ اس قسم کے دعائیہ چنتے ہیں۔ مثلاً اپنے دکھ مجھے دے دو، دیوالہ، باری کا بخار، تعطل، جنازہ کہاں ہے۔ خیر کہانیوں کے عنوان رکھ لیے، ٹھیک کیا، مطلب یہ کہ رکھ لیے، لیکن وہ تو ان پر باضابطہ عمل بھی کرتے ہیں۔ وہ افسانہ نگار ہیں یا کیمسٹ کی طرح پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ۱۹۷۷ء سے وہ لگاتار بیمار ہیں (لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ پیدا ہی بیمار ہوئے تھے)۔ ۱۹۷۸ء میں ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ وہ اسے سہہ گئے۔ یہ الگ بات ہے لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ شخصی طور پر وہ اب بھی راجندر سنگھ بیدی ہیں، لیکن ان کے اندر کا وہ شمشاد قد فن کار چپ ہو گیا ہے جو اس عہد کی افسانہ نگاری کی روح و رواں تھا۔ راجندر سنگھ بیدی جیالے آدمی ہیں۔ انھوں نے بہت کچھ ہارا ہے لیکن ہمت نہیں ہاری ہے۔ ادھر ڈوبے اُدھر نکلے کا عملی مظاہرہ بھی کریں گے۔ بس کچھ دن اور انتظار کرنا ہوگا۔

راجندر سنگھ بیدی نے اخلاق و آداب، ابھی تک چھوڑے نہیں ہیں۔ اپنے اس عالم چنیں و چناں میں بھی، جب کہ ان کا آج ادھر اُدھر جانا ٹھیک نہیں، وہ 'رسم دوست داری' سے دست بردار نہیں ہوئے ہیں۔ انھیں کوئی بلائے تو ان کی بے کلی، بے قراری شروع ہو جاتی ہے۔ زید مجنوں کی طرح لرزاتے پہنچیں گے ضرور۔ صرف معذرت کرنے کی خاطر۔ یہ راجندر سنگھ بیدی ہیں، پا عشق پیچاں کی بیل۔

انھیں لوگوں کے جگہوں کے اور کتابوں کے نام یاد نہیں رہتے لیکن باتیں سب یاد رہتی ہیں۔ سنیچر ۱۳؍ جون کو ان سے ملاقات ہوئی، تو معلوم نہیں کس بات پر کہنے لگے، وہ ناول میں نے پڑھی ہے بھئی، وہی ناول جو ہمارے انھوں نے لکھی ہے، کہیں کہیں تو بہت بلند ہے۔ ان کا نام دیکھیے ذہن میں ہے، لیکن زبان پر نہیں آ رہا ہے۔ ارے ہمارے پرانے

دوست ہیں۔ میں نے اس ناول کی چاروں جلدیں پڑھ ڈالیں۔ میں نے کہا، آپ حیات اللہ انصاری کے ناول کا تو ذکر نہیں کررہے ہیں۔ بولے ہاں ہاں، اسی کی بات کررہا ہوں۔

اس سے کچھ دن پہلے میں ان کے ہاں گیا تھا، تو دیکھا بھگوت گیتا پڑھ رہے ہیں، رادھا کرشنن کا انگریزی ترجمہ اور تالیف۔ کتاب میز پر رکھ دی اور مسکرائے (یہ مسکراہٹ بہت اندر سے آئی تھی)۔ خوش تھے۔ بولے کتابیں پڑھتا ہوں، لیکن ایک صفحہ ختم کرنے کے بعد دوسرا صفحہ شروع کرتا ہوں تو بھول جاتا ہوں کہ پہلے صفحے پر کیا پڑھا تھا۔ میں نے کہا بیدی صاحب! یہ آپ کی بھول ہے۔ آپ بھول نہیں جاتے بلکہ جو کچھ پڑھتے ہیں اسے جذب کر لیتے ہیں۔ پوچھا، کیا آپ نے یہ کتاب پڑھی ہے۔ میں نے کہا، میں تو نہیں کہتا کہ میں نے یہ کتاب پڑھی ہے، لیکن یہ میرے پاس موجود ضرور ہے اور میں اسے کبھی کبھی دیکھ لیتا ہوں۔ بولے، کتاب کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ لینا بھی کتاب پڑھنے میں داخل ہے ۔۔۔۔۔ بیدی صاحب نے انگریزی میں شعر بھی کہے تھے (انگریزی شاعری میں عروض نہیں ہوا کرتے اور اگر ہوتے بھی ہیں تو کوئی ان کی ہروا نہیں کرتا) اور ان کے ہاں انگریزی کلاسک کا اتنا ذخیرہ ہے کہ دو چار کتابیں چرا لینے کو جی چاہتا ہے۔ معلوم نہیں بیدی صاب نے یہ کتابیں کیسے جمع کی ہوں گی۔

راجندر سنگھ بیدی کی مشہور و معروف 'چہل' ابھی گئی نہیں ہے، لیکن زخمی ضرور ہوئی ہے، ورنہ یہی بیدی صاحب تھے جو محفلوں کو اپنے لطیفوں سے نہلا دیتے تھے۔ ایک لطیفہ ختم کرنے سے پہلے دوسرا لطیفہ شروع کر دینے کا فن صرف صاحب کو آتا ہے ۔۔۔۔ محفلوں میں وہ اب اٹھتے بیٹھتے ہیں، لیکن بولتے کچھ نہیں۔ ایک مرتبہ بڑی گمبھیر سنجیدگی سے کہنے لگے، مجھ سے جملے بنتے نہیں ہیں، بیچ ہی میں کہیں رک جاتے ہیں، کبھی کوئی صحیح لفظ نہیں ملتا اور کبھی خالی ادھورا رہ جاتا ہے۔ شعر سنتا ہوں، داد دینے کو جی چاہتا ہے لیکن صرف گردن ہلا کر چپ ہو جاتا ہوں اور شاعر سمجھتا ہے شعر میں نے سمجھا نہیں ۔۔۔۔ جی میں آیا کہوں، بیدی صاحب آپ گرامر اور عروض وغیرہ کی پروا کیے بغیر ہی کہا کیجیے۔ کوئی آپ کا کیا بگاڑ لے گا ۔ لیکن بیدی صاحب سے کچھ کہتے ڈر لگتا ہے۔ صاحب موصوف پہلے ہی بہت حساس تھے اور اب تو ع اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے، کی طرح ہو گئے ہیں۔ ان کی ناراضی سے، ان کی اُداسی سے خوف ہوتا ہے۔ پچھلے ایک سال میں تو وہ بہت سنبھلتے ہیں اور صرف مسکراتے ہی نہیں، ہنستے بھی ہیں۔

لڑکپن کے بم ساز راجندر سنگھ بیدی آگے چل کر دوستوں کے دمساز تو بنے لیکن زمانہ ساز نہیں بن سکے۔ یہ فن انھیں نہیں آیا۔ وہ بس دوستوں پر جان اور محفلوں میں پان چھڑکتے رہے۔ جب وہ بے تحاشا پان کھاتے تھے تو نہ ستم کی پروا کرتے تھے، نہ سکندر کی۔ ان کے اپنے کپڑے تو خیر ان کے اپنے ہی کپڑے تھے لیکن دوسروں کے کپڑوں سے بھی انھوں نے غیریت نہیں برتی۔ ان کا مخاطب ہمیشہ لہولہان ہو جاتا تھا۔ کہتے تھے یہ خلوص کی نشانی ہے، اور کیا یاد کرو گے کہ

کسی رئیس سے سابقہ پڑا تھا۔ ایک مرتبہ بیمار ہوئے تو کھار (بمبئی) کے کسی نرسنگ ہوم میں رکھے گئے۔ جب بھی ان کے تیمار داران سے ملنے جاتے، انھیں نرسنگ ہوم میں داخل ہو کر ان کے کمرے یک جانے کی کبھی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی تھی۔ راجندر سنگھ بیدی نرسنگ ہوم کے قریب ہی ایک پان کی دکان پر کھڑے مل جاتے۔ کئی پان ان کے منہ میں اور پانوں کا ایک پلندہ ان کے ہاتھ میں ہوتا۔ اس بات کو کئی سال ہو گئے لیکن وہ دکان دار اب بھی نرسنگ ہوم جا کر کسی نہ کسی ملازم سے ضرور پوچھ آتا ہے، بھائی صاحب! وہ سردار جی پھر بیمار نہیں ہوئے۔ میرا کاروبار مندا پڑا ہے، انھیں کسی طرح بلائیے۔ کہتے تھے اس کی دکان پر مجھے بار بار اس لیے جانا پڑتا ہے کہ نرسنگ ہوم میں کھانا ہی کتنا ملتا ہے۔ پان انھوں نے کبھی گن کر نہیں کھائے۔ ان کا عقیدہ ہے گننے سے پان کا مزہ بگڑ جاتا ہے۔ پان میں وہ تمباکو کو اتنی مقدار میں ڈالتے ہیں کہ پھر پان کو موڑا نہیں جا سکتا۔ سگریٹیں بھی انھوں نے کم نہیں پی ہیں۔ اصل میں انھوں نے کم و بیش اور بیش و کم کا جھگڑا ہی کبھی مول نہیں لیا۔

گوشت خوری ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے اور مرغی کے شکار کو وہ سب سے بہتر سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں شکار کے لیے بیابان کوں جایا جائے، دسترخوان ہی کیوں نہ چنا جائے۔ کسی مسلمان دوست کے ہاں کھانا کھاتے تو ضرور داد دیتے اور کہتے گوشت تو مسلمانوں ہی کا کھانا چاہیے۔ اس کے بعد تارا سنگھ کے لطیفے سناتے۔

بمبئی میں لطیفوں کی سب سے اونچی دکان راجندر سنگھ بیدی کی تھی۔ ان کے ہاں سکنڈ ہینڈ مال نہیں ملتا تھا۔ صرف منتخب چیزیں ہوتیں جن میں سردار جیوں کے لطیفے زیادہ ہوتے۔ بیدی صاحب ان لطیفوں کو ہر جگہ تقسیم کرتے تھے، گویا ان کی ترویج و اشاعت کرنا انھیں کی ذمے داری تھی۔۔۔۔ اس معاملے میں وہ ہمیشہ فرض شناسی سے اپنا کام انجام دیتے رہے۔

راجندر سنگھ بیدی اس بات پر نازاں رہے کہ مساوات کا جو جذبہ پیہم سردار جیوں میں ہے وہ کسی اور میں نہیں۔ ایک دن فرمایا، ہم میں کوئی ذہین آدمی اس لیے پیدا نہیں ہوتا کہ ہم مساوات کے قائل ہیں۔ دوسروں سے آگے نکل جانا ہمارا شیوہ نہیں۔ دن کے ۱۲ بجے کو وہ ہمیشہ اپنا غلامتی نشان مانتے (علامتی نشان غالباً غلط ترکیب ہے۔ یہ میری ترکیب ہے)۔ خود کہا کرتے ہیں کہ جن دنوں وہ ماٹونگا میں سٹھیا سدن نام کی بلڈنگ میں رہتے تھے اور اپنے گھر سے اپنے دفتر ڈاچی فلمز جانے کے لیے باہر نکلتے تو کوئی بارہ بجے کا وقت ہوتا۔ بمبئی میں سڑک پر چلنے والے لڑکے بلکہ بڑی عمر کے لوگ بھی ہر اس شخص سے وقت ضرور پوچھتے ہیں جس کے ہاتھ پر گھڑی لگی ہو اور بیدی صاحب تو بش شرٹ کی آستین پر اس طرح گھڑی لگاتے تھے جیسے وہ ان کی گھڑی نہ ہو جگ پن ہو۔ ادھر وہ گھر سے باہر نکلے اور کسی نہ کسی لڑکے نے ان سے وقت ضرور پوچھا۔ یہ گھڑی دیکھتے ٹھیک بارہ بجے ہوتے۔ ان کا پارہ چڑھ جاتا۔ خود کہتے ہیں، ان بیچارے بچوں کو بالکل

پتا نہیں تھا کہ ہم لوگوں سے ۱۲ بجے پوچھنے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ یہ بات تو انھیں میرے سلوک کی وجہ سے معلوم ہوئی۔۔۔اس کے بعد انھوں نے گھر سے ۱۲ بجے نکلنا ہی موقوف کر دیا۔ ناشتہ کرتے اور صبح دس بجے ہی نکل جاتے۔رفتہ رفتہ انھیں اس کی اتنی عادت ہوگئی کہ انھوں نے فلم ۱۰ تک بنائی۔

بیدی صاحب البتہ ان دنوں بہت پریشان رہے جب کہ امریکی چاند پر ہو آئے او ان کے جواب میں یعنی انتقاماً سورج پر جانے کے پروگرام کا لطیفہ مشہور ہوا۔ بیدی صاحب پریشان اس لیے تھے کہ جب انھوں نے خودکسی کو اپنا یہ منصوبہ بتایا نہیں تھا تو ان کا راز افشا کیسے ہوا۔۔۔لیکن انھوں نے اپنے بچاؤ کی ترکیب یہ نکالی کہ جہاں بھی جاتے، پہلے ہی اعلان کر دیتے کہ سورج پر جانے کا پروگرام میرا نہیں کسی اور کا ہے۔ میں تو گہری نیند سونے کا عادی ہوں۔

بیدی صاحب اب بھی افسوس کرتے ہیں کہ انھوں نے چند دن ڈاک خانے میں کیوں کام کیا۔ ان کے ڈاک خانے کا جو نظام اس وقت سے جو بگڑا تو اب تک سدھر نہیں پایا۔ن میں ایک قباحت اور بھی ہے۔ وہ اب بھی اپنے آپ کو طالب علم بلکہ شاگرد سمجھتے ہیں (طالب علم اور شاگرد مے نفرق یہ ہوتا ہے کہ شاگرد زیادہ مطیع وفرماں بردار ہوتا ہے)۔عالم شاگردی میں، میں نے انھیں اس وقت دیکھا جب ۵، ٦ سال پہلے او پندر ناتھ اشک بمبئی ٹھہرے تھے۔ مجروح سلطان پوری کے ہاں ایک محفل میں جس میں زہرہ نگاہ بھی شریک تھیں، بیدی صاحب مع اشک صاحب کو میں اپنی کہانیاں دکھایا کرتا تھا۔ آل احمد سرور صاحب سے بھی انھیں اتنی ہی رغبت ہے۔ان معاملوں میں وہ لطیفہ گوئی اور جملہ سازی کو قریب بھی نہیں آنے دیتے۔ وہ کہتے ہیں آدمی کو صرف ادیب ہی نہیں، مئودب بھی بننا چاہیے۔ وہ ادب نہ سہی، یہ ادب بھی آجائے تو بہت ہے۔ مؤدب ادیب بس یہی ایک ہیں۔

انھیں معلوم ہوگا لوگ انھیں بہت پیار سے یاد کرتے ہیں۔ کراچی سے مشفق خواجہ نے ۴۲ خط صرف ان کے لیے لکھے ہوں گے کہ ان سے کسی طرح کوئی چیز لے کر ان کے تخلیقی ادب کے لیے بھیجی جائے۔ بیدی صاحب سے میں نے جب بھی کہا، بولے میں نہیں لکھ سکتا۔ میرا سیدھا ہاتھ، سیدھا پانو اور سیدھی آنکھ تینوں متاثر ہیں۔ ایک مرتبہ بہت ہی دل گرفتہ ہو کر بولے، میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا جو مجھے سب کچھ دیکھنا پڑ رہا ہے۔ وہ بہر حال اب پڑھتے بھی ہیں اور چلتے بھی۔ جہاں تک لکھنے کا تعلق ہے، وہ اکتوبر یا نومبر تک نہ صرف لکھیں گے بلکہ ایسا لکھیں گے کہ لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ وہ گھر بیٹھے سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔

اس دن البتہ وہ تھوڑے سے ناراض ہو گئے جب میں نے ان سے کہا، اچھا آپ خود نہیں لکھ سکتے تو میں لکھتا ہوں۔ ''بیدی کی خود گفتہ سوانح عمری۔'' آپ بولتے جایئے میں لکھتا جاؤں گا۔ بولے، نہیں بھئی، یہ بھی نہیں لکھوں گا، بلکہ میرے پاس لکھی پڑی ہوگی۔ کچھ تو وہ ''ہاتھ ہمارے قلم ہوئے'' میں لکھ چکے ہیں۔ میں نے ان کا اعتراف پڑھا تو دنگ رہ

گیا۔ بہت ہی معصوم نظر آنے والے ہنس مکھ بیدی کسی زمانے میں کتنے خطرناک آدمی تھے ۔ یہ میں تھوڑے ہی کہہ رہا ہوں ۔خود فرماتے ہیں:

> ''کچھ لڑکوں کو ساتھ لے کر میں نے ایک کھنڈر میں بم بنانے کی کوشش کی۔ انگریز گورنر مونٹ مورسنی تو جوں کا توں سلامت رہا، لیکن میرے ایک ساتھی کا ہاتھ اڑ گیا۔ وہ میرا ہاتھ بھی ہوسکتا تھا۔ باپ روز اریو! جس سے میں نے بعد میں کہانیاں لکھیں اور اب اسے آپ کے ہاتھ پر رکھے ہوءان گناہوں کا اعتراف کرر ہا ہوں۔''

کیا بیدی صاحب کہہ سکتے ہیں کہ ان کہانیاں بم نہیں ہیں ۔دستی بموں اور قلمی بموں میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔

بیدی صاحب نے ابتدائے عمر میں لوگوں کا کلام بھی چرایا اور اپنے نام سے چھپوایا ہے (زیادہ لوگوں کا نہیں صرف ایک لوگ کا اور وہ بھی صرف ایک مرتبہ) ۔اس کا انھیں افسوس ہے۔ پتا نہیں افسوس چوری کا ہے یا صرف ایک مرتبہ چوری کرنے کا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر انھوں نے اپنے آپ کو دیکھنے کی کوشش کی ہے لیکن ابھی انھوں نے اپنے آپ کو پوری طرح دیکھا نہیں ہے۔

لیلیٰ را با چشم مجنوں باید دید

ایک وقت آئے گا جب بیدی صاحب ایک اور آئینے کے سامنے کھڑے ہوں گے ۔اُس وقت چاہے وہ اپنا سامنہ لے کے نہ جائیں، لیکن ریشہ حظمی ضروری ضروری ہو جائیں تو آئینے میں صرف دھند دکھائی دیتی ہے۔ اپنا عکس نہیں ۔ بیدی صاحب آئینہ دیکھنے کی صحیح ترکیب جانتے بھی نہیں ہیں، ورنہ اس فن کے ماہرین تو کچھ اس طرح آئینہ دیکھتے ہیں کہ اسے بھی جھوٹ بولنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

کہاں کس سے متفق ہونا چاہیے، یہ بات بھی بیدی صاحب نہیں جانتے ۔ایک مرتبہ کسی مداح نے ان کے سامنے ان کی تعریف کی اور کہا، ''بیدی صاحب! آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔'' انھوں نے فرمایا، ''میں جی (پنجابی انداز)، جی میں تو کچھ نہیں۔'' اور ان کے مداح نے ان کی بات مان لی۔ جب انھوں نے کہا تھا آپ بڑے آدمی ہیں تو بیدی صاحب کو کہنا چاہیے تھا، ''میں آپ کی مردم شناسی کا قائل ہوں۔''

☆☆☆

مشتاق احمد یوسفی

ناٹک

بے درودیوار ناٹک گھر بنایا چاہیے

صحیح نام اور پتا بتانے سے قاصر ہیں اس لیے کہ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔ سردست اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ اس تھیٹر کو اداکاروں کی ایک کوآپریٹیو سوسائٹی نقصان باہمی کی بنیاد پر چلا رہی تھی۔ پہلی تاریخ کو بڑی پابندی سے مہینے بھر کا خسارا تمام ممبران کو بحصّہ مساوی بانٹ دیا جاتا تھا۔ صرف ٹکٹ گھر پختہ تھا کہ اس پر کھیل کے بعد اکثر حملے ہوتے رہتے تھے۔ ہال کی دیواریں اور چھت ٹاٹ کی تھیں جن میں خلاف محاورہ پیونٹ بھی ٹاٹ ہی کے لگے تھے۔ چھت قمری کلینڈر کا کام دیتی تھی۔ ٹاٹ کی قناتوں میں بھی جا بجا سر کے برابر سوراخ ہو گئے تھے۔ کھیل کے شروع میں ان کا سر گھسا کر باہر والے اندر کا تماشا دیکھتے۔ آخر میں اندر والے گردن نکال کر باہر کی رونق دیکھ لیتے تھے۔ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ پونے تو آنے کا ہوتا تھا۔ اس میں صوفوں کا تکلف تھا جن کے فولادی اسپرنگ لباس مجاز پھاڑ کر چھ چھ انچ باہر آئے تھے۔ انھیں رانوں کے بیچ میں لے کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ سکینڈ کلاس کا ٹکٹ چھے آنے کا تھا۔ اس میں سرکنڈوں اور لوہے کی پتریوں کے مونڈھے، مونجھ کی پیڑھیاں اور کھٹولیاں پڑی تھیں۔ تیسرے درجے میں فرشی کا اہتمام تھا۔ 'فرشی' سے ہماری مراد فرش خاکی ہے۔ اس کلاس مین جو ناظرین باتمکین زیادہ نک چڑھے واقع ہوئے تھے، وہ گھر سے انگوچھے کے کون میں ریزگاری باندھ کر لاتے۔ کسی گانے یا ناز و ادا پر طبیعت بے قابو ہو جائے تو نیچے سے نکال کر گوپھن کی طرح گھماتے اور اسٹیج پر داد کے انگوچھے برساتے۔ رواداری میں ہم یہ بتانا بھول ہی گئے کہ پیچھے بیٹھنے والوں کی سہولت کے لیے ہال میں نشستی ڈھلان اس طرح پیدا کیا گیا تھا کہ اگلے یعنی اسٹیج سے ملحق حصے میں دو ڈھائی فٹ گہری زمین کھود کر ایک اکھاڑا سا بنا دیا گیا۔ اس میں فرسٹ کلاس والے خاک پھانکتے اور سکینڈ کلاس والے لوٹیں لگاتے تھے۔ اکھاڑے کے دائیں بائیں منڈیر پر چند 'خلیفے' پیر لٹکائے بیٹھے رہتے تھے۔ اسے گیلیری سمجھ لیجیے۔ آرکسٹرا اور فرسٹ کلاس کے درمیان ہم نے ہمیشہ ایک پھوڑا پڑا دیکھا اور کبھی کبھار یہ بھی دیکھا کہ پیچھے بیٹھنے والے کسی 'ناظرین باتمکین' (تماشائی کے لیے یہی صیغۂ جمع استعمال ہوتا ہے) کو کسی دوسرے 'ناظرین' کی ٹوپی یا کلف دار طرّہ نظر آنے لگے تو وہ انٹرول میں خود پھاوڑے سے ایک دو بالشت اکھاڑا کھود کر سرکش صوفے کو مع سرِ پُرغرور زمین میں دھنسا دیتا تھا۔ اسی آلے کے پاس ایک ادھ کھُدی قبر میں منشی ریاضت علی سوختہ سندیلوی کی کھٹیا پڑی رہتی تھی۔ ان کا صرف چہرہ اور مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی پھدکتی نظر آتی تھی۔

مصوردرد منشی ریاضت علی سوختہ :

یہ بزرگ جوسٹر کے پیٹے میں ہوں گے اسی گھٹیا پر گاؤ تکیہ لگائے صاحب فراش رہتے تھے۔ایک پاؤں قبر میں، دوسرا اسٹیج پر۔سپیدہ میدہ رنگ جو جوانی ہی میں نہیں اب بھی شہابی تھا۔تیکھے تیکھے نقوش، غلافی آنکھیں، بے شکن پیشانی۔ انھیں اس بڑھاپے میں بھی بے وجیہہ کہا جاسکتا تھا۔ بر میں سپید ململ کا چنا ہوا کرتا۔کرتے پر کشیدے سے کڑھے ہوئے چنبیلی کے سپید پھول، پھولوں میں تازہ پان کا رنگ بھرا ہوا، پھنسا پھنسا چوڑی دار پاجامہ۔نڈھال نڈھال سے رہتے تھے۔ پاجامے کے علاوہ کسی چیز میں چستی نہیں پائی جاتی تھی۔(پہننے کے بعد پائنچے کس کے سیتے تھے۔) سرخ ریشمی ازار بند میں ٹرنک کی چابی جھولتی رہتی تھی۔تھیٹریکل کمپنی نے انھیں روٹی کپڑے پر اداکاروں کا شین قاف درست کرنے کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔اس کے علاوہ پہلی تاریخ کوسوڈیڑھ سوروپے ماہوار کا گھاٹا ان کے نام کھاتے میں درج کر کے بھرپائی کے دستخط لے لیے جاتے تھے۔یہ منشی دل کے مکالموں میں جہاں تہاں سوز وگداز کے پیوند لگاتے جو بسا اوقات اصل سے بھی بڑے ہوتے تھے۔مصورِ درد کہلاتے تھے۔ہمارے سر میں بھی ان کے مکالموں سے کئی دفعہ وہ ہوا جس کے یہ مصور کہلائے جاتے تھے۔ہمارے سر میں بھی ان کے مکالموں سی کئی دفعہ وہ ہوا جس کے یہ مصور کہلائے جاتے تھے۔اس تھیٹر میں کوئی کسی کا آقا یا ملازم نہیں تھا۔سب مل جل کر کام بگاڑتے اور ایک دوسرے کے سر درد اور مسائل میں اضافہ کرتے رہتے۔مکالمے تو بالعموم منشی دلؔ کے ہوتے تھے لیکن ناظرین کی اکثریت اور ہال کے ماحول کے پیش نظر اداکار بھی ان میں فی البدیہہ تضمین اور حک و اضافہ کرتے رہتے تھے۔مثلاً کسی دن ہال میں پٹھان ناظرین کی اکثریت ہوتو سلطان صلاح الدین ایوبی کی فتح کے منظر میں سے سے کفن باندھ کر گمسان کا خٹک رقص ہوتا ورنہ ہم جیسوں کو تو کتھک ناچ پر ہی ٹرخا دیا جاتا اور اگر کسی دن فرسٹ کلاس میں کوئی بڑا کاٹھیاواڑی سیٹھ نظر آجائے تو ماسٹر غفار یعنی فرہاد اپنا گنڈاسا یعنی تیشہ کوہ بے ستون کے دامن میں پھینک دیتا اور گجراتی مناجات کے ذریعے غیبی طاقتوں سے فوری تعاون اور ہنگامی امداد طلب کرتا۔

سیٹ ڈیزائن :

سیٹ اور پردے بھی سب کی صلاح اور مشورے سے بنائے جاتے تھے۔چنانچہ سینری کے ہر رنگ سے مشورہ ٹپکتا تھا۔ایک پردے پر گانو کا روح پرور منظر کچھ اس طرح دکھایا گیا تھا کہ ایک البیلی مٹیار، سر پر ایک چمپئی رنگ کا گول مٹکا رکھے پنگھٹ جارہی ہے جہاں حضرت امیر خسروؒ کے حلیے کے ایک بزرگ بغل میں ننگی تلوار دابے اوک سے پانی پی رہے ہیں۔س ارا ڈول خالی ہوگیا مگر نظریں کہہ رہی ہیں کہ ''گوری! پردیسی کی پیاس نہیں بجھی، اور۔۔۔۔ دور پس منظر میں گانو کے جوہڑ میں ایک اسٹیمر کھڑا ہے جس کی چمنی کے دھویں سے آسمان پر ''اللہ'' رقم ہوگیا ہے۔سامنے گلابی گھاس پر

ایک سبز رنگ کی گائے چر رہی ہے۔ کونے میں گملا رکھا ہے جس میں گلاب میں چنار کے پتے لگے ہیں۔ دائیں جانب ایک کٹا دم سے سوالیہ نشان بنائے کھڑا ہے۔ کھیل کے آخری سین سے پہلے مینجر کمپنی ہٰذا اسٹیج کے کنارے کھڑے ہو کر اعلان کرتا کہ پبلک کے پُرزور اصرار پر اور 'کومپنی کی مشہوری' کے لیے کل بھی یہی کھیل نئی سین سینری کے ساتھ دکھایا جائے گا۔ سین سینری میں نیا پن اس طرح پیدا کیا جاتا کہ انھیں پردوں کی ترتیب الٹ دی جاتی تھی۔

نکاح روبرو، باادب، باملاحظہ:

ہر کھیل میں غزلیں داغ دہلوی اور نعتیں امیر مینائی کی گائی جاتی تھیں۔ غالب، اقبال، حسرت موہانی اور فیض کے وجود کی کمپنی ہٰذا کو ہنوز اطلاع نہیں ملی تھی۔ داغ کا سکّہ گھس ضرور گیا تھا مگر کھوٹا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ اس تھیٹر میں اکبر کے دربار میں، فیضی کی موجودگی میں بھی، تان سین داغ ہی کی غزل داغتا تھا۔ قرائن سے تو یہی لگتا تھا کہ اکبر دربار کا ڈھونگ ہی ہمیں یہ غزل سنانے کے لیے رچا تا تھا۔ کیا شوکت و دبدبہ تھا اس دربار کا! جب طرح دار کنیزوں، چوب بردار جسولینوں، قلماقنیوں، اُردہ بیگنیوں اور راجستانی یاتروں کی دورویہ قطار سے مغل اعظم کاغذ کا پھول سونگھتے ہوئے نزول اجلال فرماتے تو ایک جاہل نقیب چوب نقرئی ٹھونک کر صدا دیتا:

نکاح روبرو، باادب، باملاحظہ، ہوشیار

سارے اسٹیج کی لکڑیاں اور لکڑیاں لرز اٹھتیں۔ خدا جانے اس میں اس کے تلفظ کا دخل تھا یا ہمارے حسن سماعت کا دخل۔ نکاح کی شرعی دھمکی کے علاوہ 'ہوشیار' بھی اس گھن گرج سے ادا کرتا جیسے اندھیری راتوں کو چوکیدار لاٹھی بجا بجا کر چوروں کو خلق خدا سے ہوشیار خبردار کرتے ہیں۔

اُس زمانے میں ہال میں سگریٹ بیڑی پینے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ البتہ اسٹیج کے دائیں چوبی ستون یعنی بلّی پر ایک نوٹس آویزاں تھا۔

''شراب پی کر دُند مچانا، دنگا کرنا منع ہے۔''

حالات سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ناظرین نے اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ بغیر شراب پیے، دنگا فساد کرنے پر کوئی پابندی نہیں۔

'وَنس مور!' :

اسٹیج کے پہلے پردے کے اوپر جو جھالر ہوتی ہے اس کی اوٹ میں خالی مٹکوں کی ایک قطار تھی جن کے پیندے ناظرین کی طرف اور منہ ایکٹر کی طرف۔ مقصد ان کا ایکٹر کی آواز میں گونج اور گرج پیدا کرنا تھا۔ یہ مائیکروفون کا نعم البدل تھے۔ ان

کی موجودگی کا ہمیں اس وقت علم ہوا جب ایک گھڑا اسہراب کے سر پر عین اس وقت گرا جب وہ ناخلف اپنے باپ رستم سے ہاتھ چل چلا کر نہایت مقفٰی و مسجّع اردو میں گستاخانہ کر رہا تھا۔ پردہ کھینچنے کے فرائض خود منیجر کمپنی ہٰذا سیاہ ''بو'' لگائے اپنے دست خاص سے انجام دیتے تھے۔ ون میں دوہرے ہو کر اس طرح کھینچتے تھے جیسے گہرے کنویں کے ڈول کو پنہاری۔ شائقین کو موت یا قتل کا کوئی سین بطور خاص پسند آتا اور ''ونس مور! ونس مور!'' کی صدائیں آتیں تو اسے بار بار دکھایا جاتا۔ مقتول اٹھ اٹھ کر حیدر آبادی انداز سے ہاتھ کا اوک بنائے سب کو آداب و تسلیمات بجا لاتا اور پھر انتقال فرما کے دکھاتا۔ دیکھنے والے عموماً ٹریجڈی پسند نہیں کرتے تھے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ بعض ڈرامے ہی ایسے ہوتے تھے جن میں اصل مجرم یعنی مصنف کے علاوہ سب قتل کر دیے جاتے تھے۔ کھیل شروع ہونے سے پہلے ردے کے پیچھے سے کوئی صاحب گھڑے میں منہ ڈال کر گونج دار آواز میں لاکھ برا چاہنے والے مدعی کو مطلع کرتے:

وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

لیکن اگر اس سے ان کی مراد وہ تھی، جو کچھ اسٹیج پر ہوتا تھا تو اس کی منظوری کا الزام خدا پر رکھنا منشی ریاضت علی سوختہ سندیلوی کی صریحاً حق تلفی ہوگی۔

ٹریجڈی کو کامیڈی میں بدلنے کا نسخہ :

اس زمانے کے چلن کے مطابق ٹریجڈی کو کامیابی کا رنگ دینے کی یہ ترکیب نکالی گئی کہ تمّت بالخیر یعنی آخری سین میں عاشق نامراد کی تربت دکھائی جاتی ہے جس پر ایک ہزار کینڈل پاور کو نور برس رہا ہے۔ سوگواز ہیروئن سیاہ برقع اور سیاہ چوڑیاں پہنے، طباق سا منہ کھولے آتی ہے۔ اسٹیج کے عقب میں خالی کنستروں پر کود کود کر بجلی کڑکنے کا صوتی تاثر دیا جاتا ہے۔ ہیروئن ایک ہاتھ میں چھتری اور دوسرے سے غرارے کے پائنچے اٹھائے ہوئے ہے۔ وہ ''السلام علیکم یا اہل القبور'' کہہ کر قبر سے لپٹ کاتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے علاوہ اسٹیج پر بھی اندھیرا چھا جاتا ہے۔ بجلی پھر کڑکتی ہے اور قبر شق ہو جاتی ہے۔ اس میں سے ہیرو و مرحوم و مدفون علی گڑھ کٹ پاجامہ، ترچھی رام ٹوپی اور عطر سہاگ لگائے کفن پھاڑ کر برآمد ہوتا ہے۔ دونوں قبر پر بیٹھ کر بلمپت میں حمد لگاتے اور آفات ارضی وسماری کو للکارتے ہیں۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھتا ہے۔ پھر فردوس بریں کا منظر ہوتا ہے جہاں مردوں کی سرگرمیاں دکھائی جاتی ہیں۔

شاذ و نادر ہی کوئی ایسا ڈراما ہوتا تھا جس میں فرض اور محبت کی خونیں ٹکّر نہ دکھائی جائے۔ مثلاً منشی ریاضت علی سوختہ سندیلوی نے پانچوں انگلیاں خون دل میں ڈبو کر ایک رقت انگیز سین لکھا تھا جس میں شہزادہ سلیم کو اپنے ہی نام کی شاہی جوتی پہنے اسٹیج پر لمبے لمبے ڈگ مارتا، جذباتی کش مکش میں مبتلا دکھایا جاتا ہے۔ ایک طرف فرض ہے، دوسری طرف

محبت اور تیسری طرف۔۔۔۔جدھر منشی جی کی نظر نہیں گئی، عقل سلیم یعنی comman sense انارکلی کے گریباں میں منہ ڈالے کھڑی ہے۔آخر میں تینوں لہولہان ہوجاتے ہیں۔ فتح تینوں میں سے کسی کی نہیں ہوتی۔ فتح ہوتی ہے منشی ریاضت علی سوختہ سندیلوی کے ایک ناموزوں مصرع کی جس پر کھیل کا خاتمہ ہوتا ہے۔

اسٹیج کے آلات کشاورزی :

فرسٹ کلاس میں بیٹھنے والوں کو گرین روم میں جا کر اداکاروں کو مبارک باد کے علاوہ نقدی دینے پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔گرین روم کی دیواریں چٹائی کی اور ستون بانس کے تھے۔چھت یاد نہیں کاہے کی تھی۔غالباً سمنٹ کی نہیں تھی۔چق سے ذرا دور میک اپ کے لیے ایک کھوکے پر چیچک زدہ قد آدم آئینہ رکھا تھا۔اس آئینے میں چہرہ نظر آنا تو بعد کی بات ہے خود آئینہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔قد آدم ہم نے اس لیے کہہ دیا کہ آدمی کا قد ساڑھے تین فٹ بھی ہوسکتا ہے۔اس کے پہلو میں تختِ طاؤس پڑا تھا جو اچھے دنوں میں ڈینٹسٹ کی کرسی رہ چکا تھا۔اب اس پر نادرشاہ درانی کے دانت تھے۔ چاروں طرف ناٹک کے آلات کشاورزی بکھرے پڑے تھے۔

نورجہاں کے درو کبوتر، نظام سقّہ کی مشک، مجنوں کا گریباں، لات گھونسے کھانے والے ولن کی پیٹھ کا حفاظتی پیڈ۔ سائیکل کے اگلے بریک کے دوشاخے سے بنایا ہوا اسٹیتھس کوپ جسے کانوں سے لگا کر ڈاکٹر مریضہ کا معائنہ کرتا تھا۔ قارورے ٹیسٹ کرنے والی لیبارٹری سے خریدی ہوئی خالی بوتلیں جنھیں رانا سانگا کے ساتھ جنگ کرنے سے پہلے توڑ کر بابر شراب نوشی سے توبہ کرتا تھا۔باتھ روم کی زنجیر جس پر سنہری پینٹ کیا ہوا تھا۔یہ زنجیرِ عدل تھی جسے کھینچ کر فریادی جہاں گیر سے فوری حاجت روائی چاہتے تھے۔آئینے کے پاس ویمپ کی ربر کی ناک پڑی تھی جسے وہ حرافہ ہر شب کٹواتی تھی۔ اتوار کو دو دفعہ کٹتی تھی اس لیے کہ میٹنی شو میں بھی اپنی بدذاتی سے باز نہیں آتی تھی۔

چوڑی دار پائجامہ :

کھیلوں میں زنانہ ملبوسات کی تراش خراش تو ظاہر ہے وہی تھی جو اس زمانے میں الٹرا ماڈرن سمجھی جاتی تھی یعنی جو آج کل ہر گھر میں نانیاں دادیاں پہنتی ہیں۔لیکن ایک نکتہ آج تک سمجھ میں نہ آیا وہ یہ کہ عورت کو جب پاک باز، پتی ورتا یا باعصمت دکھانا مقصود ہوتا تو اسے چُنا ہوا دوپٹہ اور سفید چوڑی دار پاجامہ پہنایا جاتا۔تاڑنے والے مہین مہین چنٹوں اور پاجامے کی چوڑیوں کی تعداد ہی سے عصمت کی شدت کا اندازہ کر لیتے تھے۔لیکن جب وہ بدراہ یا مائل بہ بدی ہوئی تو ساری زیب تن کر لیتی۔ چنانچہ جیسے ہی کوئی گل اندام ساری پہن کر اسٹیج پر نمودار ہوتی تو ناظرین کے دل کا کنول کھل جاتا

۔دیر تک تالیاں بجتیں جن کے منہ میں دانت تھے وہ سیٹیاں بھی بجاتے۔

پردہ اٹھتا ہے :

شو کے اوقات میں تھیٹریکل کمپنی گھڑی گھنٹے کی غلام نہ تھی۔ ۳/۲ ہال کے ٹکٹ بک جائیں تو پھر ایک گھنٹے سے زیادہ انتظار کرنا پڑتا تھا۔ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر ایک چار فٹ لمبی تختی مستقل لگی رہتی تھی۔

''ہاؤس فل نہیں ہے۔''

مسٹر ولیم شیکسپیئر مرحوم:

بیس برس ادھر کی بات ہے۔ ایسا ہی ایک اتوار اور ایسا ہی ایک شو تھا۔کھیل شروع ہونے سے پہلے ''مینیجر کمپنی ہٰذا'' نے ناظرین باتمکین کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ''اب مسٹر ولیم شیکسپیئر مرحوم کا ڈراما رومیو جولیٹ بمع چار کتھک رقص پیش کیا جائے گا۔'' مسٹر ولیم شیکسپیئر مرحوم انگریزی ڈرامے کے آغا حشر کاشمیری مرحوم ہیں (ہمیں تو آج تک ان دونوں میں مرحوم ہونے کے علاوہ کوئی اور بات مشترک نظر نہ آئی)۔مصور درد منشی ریاضت علی سوختہ سندیلوی نے مسٹر ولیم شیکسپیئر مرحوم کے ڈائیلاگ میں سے بیس مخرّب اخلاق فقرے نکال کر مسندس حالی مرحوم کے پچیس اخلاقی شعر ڈال دیے ہیں۔گر قبول افتدز ہے عز و شرف۔

اُس زمانے میں بھی کراچی میں سنیما گھروں کی کمی نہ تھی۔انگریزی فلمیں بکثرت دکھائی جاتی تھیں اور ہندوستانی فلموں پر بھی کوئی قدغن نہ تھا۔اس کے باوجود کراچی کی اس پہلی اور غالباً آخری تھیٹریکل کمپنی کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ہمارا شمار تو خیر طفیلیوں میں تھا لیکن ہم نے یہاں ایسے ایسے نک چڑھیوں کو چاؤ سے آتے دیکھا جو بولی ووڈ کی اچھی اچھی فلموں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ بات یہ ہے کہ جسے ایک دفعہ اسٹیج کا نشہ ہو جاء، پھر جب تک آنکھوں میں دم ہے اس کا ہُڑ کا نہیں جاتا۔ جس نے ایک بار گوشت پوست کا روپ دیکھ لیا اس کی تسکین پھر کبھی پرچھائیوں سے نہیں ہوگی۔ یہ اسی کا جادو نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک بے سروساماں تھیٹر کا نام برسبیل تذکرہ آ گیا اور ہم نے بلا قصد وارادہ دفتر کے دفتر لکھ ڈالے۔کون جانے اسی بہانے اس کا حق غمگساری و چارہ گری ادا ہو جائے جس نے ایک اور گمنام بے نوا کے نہ جانے کتنے اداس میں اجالا کیا۔

☆☆☆

قرۃ العین حیدر

کارمن

رات کے گیارہ بجے ٹیکسی شہر کی خاموش سڑکوں پر سے گزرتی ایک پرانی وضع کے پھاٹک کے سامنے جا کر رکی۔ ڈرائیور نے دروازہ کھول کر بڑے یقین کے ساتھ میرا سوٹ کیس اتار کر فٹ پاتھ پر رکھ دیا اور پیسوں کے لیے ہاتھ پھیلائے تو مجھے ذرا عجیب سا لگا۔

''یہی جگہ ہے؟'' میں نے شبہ سے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ میں نیچے اتری۔ ٹیکسی گلی کے اندھیرے میں غائب ہوگئی اور میں سنسان فٹ پاتھ پر کھڑی رہ گئی۔ میں نے پھاٹک کھولنے کی کوشش کی مگر وہ اندر سے بند تھا۔ تب میں نے بڑے دروازے میں جو کھڑکی لگی تھی اسے کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر بعد کھڑکی کھلی۔ میں نے چوروں کی طرح اندر جھانکا۔ اندر نیم تاریک آنگن تھا جس کے ایک کونے میں دو لڑکیاں رات کے کپڑوں میں ملبوس آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں۔ آنگن کے سرے پر ایک چھوٹی سی شکستہ عمارت ایستادہ تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے گھسیاری منڈی لکھنؤ کا اسکول یاد آگیا، جہاں سے میں نے بنارس یونیورسٹی کا میٹرک پاس کیا تھا۔ میں نے پلٹ کر گلی کی طرف دیکھا جہاں مکمل خاموشی طاری تھی۔ فرض کیجیے۔۔۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ جگہ افیمچیوں، بردہ فروشوں اور اسمگلروں کا اڈّا نکلی تو۔۔۔؟ میں ایک اجنبی ملک کے اجنبی شہر میں رات گیارہ بجے ایک گمنام عمارت کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی جو گھسیاری منڈی کے اسکول سے ملتا جلتا تھا۔۔۔۔

ایک لڑکی کھڑکی کی طرف آئی۔

''گڈ ایوننگ۔ یہ وائی ڈبلیو سی اے ہے نا۔۔؟ میں ذرا عجز سے مسکرا کے پوچھا۔۔'' میں نے تار دلوا دیا تھا کہ میرے لیے ایک کمرہ ریزرو کر دیا جائے۔'' مگر کس قدر خستہ حال وائی ڈبلیو سی اے ہے یہ۔۔۔ میں نے دل میں سوچا۔

''ہمیں آپ کو کوئی تار نہیں ملا۔ اور افسوس ہے کہ سارے کمرے گھرے ہوئے ہیں۔۔۔''

اب دوسری لڑکی آگے بڑھی۔۔۔۔ ''یہ ورکنگ گرلز ہوسٹل ہے۔ یہاں عام طور سے مسافروں کو نہیں ٹھرایا جاتا۔۔'' اس نے کہا۔

میں یک لخت بے حد گھبرا گئی۔۔۔اب کیا ہوگا؟ میں اس وقت یہاں سے کہا جاؤں گی۔۔۔؟ دوسری لڑکی میری پریشانی دیکھ کر خوش خلقی سے مسکرائی۔

''کوئی بات نہیں۔گھبراؤ مت۔۔۔اندر آ جاؤ۔لو ادھر سے اندر آ ؤ۔۔۔''

''مگر کمرہ تو کوئی خالی نہیں ہے۔۔۔۔۔''میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا''میرے لیے جگہ کہاں سے ہوگی؟''

''ہاں ہاں،کوئی بات نہیں۔ہم جگہ بنا دیں گے۔اب اس وقت آدھی رات کو تم کہاں جا سکتی ہو؟''اسی لڑکی نے جواب دیا۔۔۔میں سوٹ کیس اٹھا کر کھڑکی سے اندر آنگن میں کود گئی۔لڑکی نے سوٹ کیس مجھ سے لے لیا۔عمارت کی طرف جوتے ہوئے میں نے جلدی جلدی کہا۔۔۔''بس آج کی رات مجھے ٹھہر جانے دو۔میں کل صبح اپنے دوستوں کو فون کر دوں گی۔میں یہاں تین چار لوگوں کو جانتی ہوں۔تم کو بلکل زحمت نہ ہوگی۔۔۔''

''فکر مت کرو۔۔۔۔''اس نے کہا،پہلی لڑکی شب بخیر کہہ کر غائب ہوگئی۔

ہم سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں پہنچے۔برآمدے کے ایک کونے میں لکڑی کی دیواریں لگا کر ایک کمرہ سا بنا دیا گیا تھا۔لڑکی سرخ پھولوں والا دبیز اٹھا کر اس میں داخل ہوئی۔میں اس کے پیچھے پیچھے گئی۔۔۔''یہاں میں رہتی ہوں۔تم بھی یہیں سو جاؤ۔''اس نے سوٹ کیس ایک کرسی پر رکھ دیا اور الماری میں سے صاف تولیہ اور نیا صابن نکالنے لگی۔ایک کونے میں چھوٹے سے پلنگ پر مچھر دانی لگی تھی۔برابر میں سنگھار میز رکھی تھی اور کتابوں کی الماری۔جیسے کمرے ساری دنیا میں لڑکیوں کے ہوسٹلوں میں ہوتے ہیں۔۔۔لڑکی نے فوراً دوسری الماری میں سے چادر اور کمبل نکال کر فرش کے گھسے ہوئے بدرنگ قالین پر بستر بچھایا اور پلنگ پر نئی چادر لگا کر مچھر دانی کے پردے گرا دیے۔

''لو تمھارا بستر تیار ہے۔''

مجھے بے حد ندامت ہوئی۔۔۔''سنو،میں فرش پر سو جاؤں گی۔''

''ہرگز نہیں۔اتنے مچھر کاٹیں گے کہ حالت تباہ ہو جائے گی۔ہم لوگ ان مچھروں کے عادی ہیں۔کپڑے بدل لو۔''اتنا کہہ کر وہ اطمینان سے فرش پر بیٹھ گئی۔۔۔''میرا نام کارمن ہے۔میں ایک دفتر میں ملازم ہوں اور شام کو یونیورسٹی میں ریسرچ کرتی ہو۔کیمسٹری میرا مضمون ہے۔میں وائی ڈبلیو کی سوشل سکریٹری بھی ہوں۔اب تم اپنے متعلق بتاؤ۔''

میں نے بتایا۔۔۔۔

''اب سو جاؤ۔۔۔''مجھے اونگھتے دیکھ کر اس نے کہا۔پھر اس نے دوزانو جھک کر دعا مانگی اور فرش پر لیٹ کر فوراً سو گئی۔

صبح کو عمارت جاگی۔لڑکیاں سروں پر تولیہ لپیٹے اور ہاؤس کوٹ پہنے غسل خانوں سے نکل رہی تھیں۔ برآمدے میں سے گرم قہوے کی خوشبو آرہی تھی۔دو تین لڑکیاں آنگن میں ٹہل ٹہل کر دانتوں پر برش کررہی تھیں۔

''چلو تمھیں غسل خانہ دکھا دوں۔۔۔'' کارمن نے مجھ سے کہا اور ہال میں سے گزر کر ایک گلیارے میں لے گئی جس کے سرے پر ایک ٹوٹی پھوٹی کوٹھری سی تھی جس میں صرف ایک نل لگا ہوا تھا اور دیوار پر ایک کھونٹی گڑی تھی۔اس غسل خانے کے اندر کھڑے ہوکر میں نے سوچا۔کیسی عجیب بات ہے۔۔۔مدتوں سے یہ غسل خانہ اس ملک میں، اس شہر میں، اس عمارت میں اپنی جگہ پر موجود ہے۔۔۔اور میرے وجود سے بلکل بے خبر۔۔۔اور آج میں اس میں موجود ہوں۔ کیسا بے وقوفی کا خیال تھا۔

جب میں نہا کے باہر نکلی تو نیم تاریک ہال میں ایک چھوٹی سی میز پر میرے لیے ناشتہ چنا جا چکا تھا۔کئی لڑکیاں جمع ہوگئی تھیں۔کارمن نے ان سب سے میرا تعارف کرایا۔بہت جلد ہم سب پرانے دوستوں کی طرح قہقہے لگا رہے تھے۔

''اب میں ذرا اپنے جاننے والوں کو فون کر دوں۔'' چائے ختم کرنے کے بعد میں نے کہا۔

کارمن شرارت سے مسکرائی۔۔۔''ہاں اب تم اپنے بڑے بڑے مشہور اور اہم دوستوں کو فون کرو اور ان کے ہاں چلی جاؤ۔تمھاری پروا کون کرتا ہے۔کیوں روزا۔۔۔؟''

''۔۔۔ہم اس کی پروا کرتے ہیں؟''

''بالکل نہیں۔۔۔'' کورس ہوا۔

لڑکیاں میز پر سے اٹھیں۔۔۔''ہم لوگ اپنے اپنے کام پر جا رہے ہیں شام کو تم سے ملاقات ہوگی۔'' میگدیلینا نے کہا۔

''شام کو۔۔۔؟'' ایملیا نے کہا۔''شام کو تو یہ کسی کنٹری کلب میں بیٹھی ہوگی۔''

کارمن کے دفتر جانے کے بعد میں نے برآمدے میں جا کر فون کرنے شروع کیے۔۔۔فوج کے میڈیکل چیف میجر جنرل کیموگلڈا اس جو جنگ کے زمانے میں میرے ماموں جان کے رفیق کار رہ چکے تھے۔۔۔مسز انطونیا کوسٹیلو، ایک کڑوڑ پتی کاروباری کی بیوی جو یہاں کی مشہور سماجی لیڈر تھیں اور جن سے میں کسی بین الاقوامی کانفرنس میں ملی تھی۔۔۔ الفانسو ولیرا۔۔۔اس ملک کا نامور ناول نگار اور جرنسلٹ، جو ایک دفعہ کراچی آیا تھا۔۔۔''ہلو۔۔۔ہلو۔۔۔ارے۔۔۔ تم کب آئیں۔۔۔ہمیں اطلاع کیوں نہیں دی۔۔۔'' کہاں ٹھہری ہو۔۔۔؟ وہاں۔۔۔گڈ گاڈ۔۔۔وہ کوئی ٹھہرنے کی جگہ ہے۔۔۔؟ ہم فوراً تمھیں لینے آرہے ہیں۔۔۔'' ان سب نے باری باری مجھ سے یہی الفاظ دہرائے۔سب سے آخر میں، میں ڈون گارسیا ڈیل پریڈوس کو فون کیا۔یہ مغربی یورپ کے ایک ملک میں اپنے دیس کے سفیر رہ چکے تھے اور وہیں

ان سے اور ان کی بیوی سے میری اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔ ان کے سیکریٹری نے بتایا کہ وہ لوگ آج کل پہاڑ پر گئے ہوئے ہیں۔ اس نے میری کال ان کے پہاڑی محل میں منتقل کر دی۔

تھوڑی دیر بعد مسز کوسٹیلو اپنی مرسڈیز میں مجھے لینے کے لیے آ گئیں۔ کارمن کے کمرے میں آ کر انھوں نے چاروں طرف دیکھا اور میرا سوٹ کیس اٹھایا۔۔۔

مجھے دھکا سا لگا۔ میں ان لوگوں کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ میں کارمن، ایمیلیا، برنارڈا اور روز اور مگدیلینا کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔

''سامان ابھی رہنے دیجیے۔ شام کو دیکھا جائے گا۔۔۔'' میں نے ذرا جھینپ کر مسز کوسٹیلو سے کہا۔

''مگر تم کو اس نامعقول جگہ پر بے حد تکلیف ہوگی۔'' وہ برابر دہراتی رہیں۔

رات کو جب میں واپس آئی تو کارمن اور ایمیلیا پھاٹک کی کھڑکی میں ٹھنسی میرا انتظار کر رہی تھیں۔۔۔ ''آج ہم نے تمھارے لیے کمرے کا انتظام کر دیا ہے۔۔۔'' کارمن نے کہا۔ میں خوش ہوئی کہ اب اسے فرش پر نہ سونا پڑے گا۔

ہال کی دوسری طرف ایک اور سیلے ہوئے کمرے میں دو پلنگ بچھے تھے۔ ایک پر میرے لیے بستر لگا تھا اور دوسرے پر مسز سوریل بیٹھی سگریٹ پی رہی تھیں۔۔۔ وہ اڑتیس انتالیس سال کی رہی ہوں گی۔ ان کی آنکھوں میں عجیب طرح کی اداسی تھی۔ پولینیزین نسل کی کس شاخ سے ان کا تعلق تھا۔ ان کی شکل سے معلوم نہ ہوسکتا تھا۔ پلنگ پر نیم دراز ہو کر انھوں نے فوراً اپنی زندگی کی کہانی سنانا شروع کر دی۔۔۔ ''میں گام سے آئی ہوں۔'' انھوں نے کہا۔

''گام کہاں ہے۔'' میں دریافت کیا۔

''بحرالکاہل میں ایک جزیرہ ہے۔ اس پر امریکن حکومت ہے۔ وہ اتنا چھوٹا جزیرہ ہے کہ دنیا کے نقشے پر اس کے نام کے نیچے صرف ایک نقطہ لگا ہوا ہے۔ میں امریکن شہری ہوں۔۔۔'' انھوں نے ذرا فخر سے اضافہ کیا۔

''گام۔۔۔۔۔'' میں نے دل میں دہرایا۔ کمال ہے۔ دنیا میں کتنی جگہیں ہیں اور ان میں بالکل ہمارے جیسے لوگ بستے ہیں۔

''میری لڑکی ایک وائلن بجانے والے ساتھ بھاگ آئی ہے۔ میں اسے پکڑنے آئی ہوں۔ وہ صرف سترہ سال کی ہے۔ مگر حد سے زیادہ خودسر۔۔۔ یہ آج کل کی لڑکیاں۔۔۔'' پھر وہ دفعتاً اٹھ کر بیٹھ گئیں۔۔۔ ''مجھے کینسر ہو گیا تھا۔''

''واہ۔۔۔'' میرے منہ سے نکلا۔

''مجھے سینے کا کینسر ہو گیا تھا۔۔۔'' انھوں نے بڑے الم سے کہا۔۔۔ ''ورنہ تین سال قبل۔۔۔ میں بھی۔۔۔ میں بھی اور سب کی نارمل تھی۔۔۔'' ان کی آواز میں بے پایاں کرب تھا۔۔۔ ''دیکھو۔۔۔'' انھوں نے اپنے نائٹ گون کا

کالر سامنے ہٹادیا۔۔۔میں نے لرز کر آنکھیں بند کر لیں۔۔۔۔ایک عورت سے اس کے جسم کی خوبصورتی ہمیشہ کے لیے چھن جائے۔کتنی قہرناک بات ہے۔

تھوڑی دیر بعد مسز سوریل بجھا کر سوگئیں۔کھڑکی کی سلاخوں میں سے چاند اندر جھانک رہا تھا۔نزدیک کے کمرے سے گمدیلینیا کے گانے کی دھیمی آواز آنی بھی بند ہوگئی۔

دفعتاً میرا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔

اگلا ہفتہ فیشن ایبل رسالوں کی زبان میں ''سوشل اور تہذیبی مصروفیات کی آندھی'' کی طرح ''آرٹ و کلچر'' کے معاملات میں گزرا۔دن مسز کوسٹیلو اور ان کے احباب کے حسین پُرمکانوں میں اور شامیں شہر کی جگمگاتی تفریح گاہوں مین بسر ہوتیں۔۔۔ہر طرح کے لوگ۔۔۔انٹلیچکیوئیل۔۔۔جرنلسٹ۔۔۔مصنف۔۔۔سیاسی لیڈر،مسز کوسٹیلو کے گھر آتے اور ان سے بحث مباحثہ رہتے اور میں انگریزی محاورے کے الفاظ میں اپنے آپ کو گویا بے حد ''اینجوائے'' کر رہی تھی۔میں رات کو وائی ڈبلیو واپس آتی اور ہال کی چوکور میز کے اردگرد بیٹھ کر پانچوں لڑکیاں بڑے اشتیاق سے مجھ سے دن بھر کے واقعات سنتیں۔۔۔''کمال ہے۔۔۔''روزا کہتی،''ہم اسی شہر میں رہنے والے ہیں مگر ہمیں معلوم نہیں کہ یہاں ایسی الف لیلوی فضائیں بھی ہیں۔''

''یہ بے حد امیر لوگ جو ہوتے ہیں نا۔یہ اتنے روپے کا کیا کرتے ہیں؟''ایمیلیا پوچھتی۔ایمیلیا ایک اسکول میں پڑھاتی تھی،روزا ایک سرکاری دفتر میں اسٹینوگرافر تھی۔مگدیلینا اور برنارڈا ایک میوزک کالج میں پیانو اور وائلن کی اعلا تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔یہ سب متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی لڑکیاں تھیں۔

اتوار کی صبح کارمن ماس میں جانے کی تیاری میں مصروف تھی۔کوئی چیز نکالنے کے لیے میں نے الماری کی دراز کھولی تو اس کے جھٹکے سے اوپر سے ایک اونی خرگوش نیچے گر پڑا۔میں اسے واپس رکھنے کے لیے اوپر اچکی تو الماری کی چھت پر بہت سارے کھلونے پر رکھے نظر آئے۔

''یہ میرے بچے کے کھلونے ہیں۔۔۔''کارمن نے سنگھار میز کے سامنے بال بناتے ہوئی بڑے اطمینان سے کہا۔

''تمھارے بچے کے۔۔۔؟''میں ہکّابکّا رہ گئی اور میں نے بڑے دکھ سے اسے دیکھا۔۔۔کارمن بن بیاہی ماں تھی۔

آئینے میں میرا ردعمل دیکھ کر وہ میری طرف پلٹی۔اس کا چہرہ سرخ ہوگیا اور اس نے کہا۔۔۔۔۔۔''تم غلط سمجھیں۔۔۔''پھر وہ کھل کھلا کر ہنسی اور اس نے الماری کی نچلی دراز میں سے ایک ہلکے نیلے رنگ کی چمکیلی 'بے بی بک' نکالی۔''دیکھو یہ میرے بچے کی سالگرہ کی کتاب ہے۔جب وہ ایک سال کا ہوگا تو یہ کرے گا۔جب وہ دو سال کا ہوجاۓ گا تو یہ کہے گا۔یہاں اس کی تصویریں چپکاؤں گی۔۔۔''وہ اطمینان سے آلتی پالتی مار کر پلنگ پر بیٹھ گئی اور اسی کتاب میں

سے خوبصورت امریکن بچوں کی رنگین تصویروں کے تراشے نکال کر بستر پر پھیلا دیے۔۔۔ ''دیکھو میری ناک کتنی چپٹی ہے اور نِک تو مجھ سے بھی گیا گزارا ہے۔ تو ہم دونوں کے بچے کی ناک کا سا چوتو کیا حشر ہوگا۔۔۔؟ میں اس کی پیدائش سے مہینوں پہلے یہ تصویریں دیکھا کروں گی تا کہ اس بے چارے کی ناک پر کچھ اثر پڑے۔۔۔''

''تم دیوانی ہو اچھی خاصی۔۔۔'' میں نے کہا۔ ''اور یہ نِک کون بزرگ ہیں۔۔۔؟

اس کا رنگ ایک دم سفید پڑ گیا۔۔۔ ''ابھی اس کا ذکر نہ کرو۔ اس کے نام پر مجھے لگتا ہے کہ میرا دل کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔''

مگر اس کے بعد وہ برابر کا ذکر کرتی رہی، ''میں اتنی بدصورت ہوں۔ مگر نِک کہتا ہے۔۔۔ کارمن۔۔۔ کارمن ۔۔۔ مجھے تمھارے دل سے، تمھارے دماغ سے تمھاری روح سے عشق ہے۔ نِک نے اتنی دنیا دیکھی ہے۔ اتنی حسین لڑکیوں سے اس کی دوستی رہی ہے مگر اسے میری بدصورتی کا ذرا بھی احساس نہیں۔''

گرجا سے واپسی پر، خلیج کے کنارے کنارے سڑک پر چلتے ہوئے، وائی ڈبلیو کے نمناک ہال پر کپڑوں پر استری کرتے ہوئے کارمن نے مجھے اپنی اور نِک کی داستان سنائی۔ نِک ڈاکٹر تھا اور ہارٹ سرجری کی اعلا ٹریننگ کے لیے باہر گیا ہوا تھا اور اسے دیوانہ وار چاہتا تھا۔

رات کو میں مسز سوریل کے کمرے سے کارمن کے کمرے میں واپس آ گئی تھی، کیونکہ مسز سوریل اپنی لڑکی کو پکڑ لانے میں کامیاب ہوگئی تھی اور لڑکی اب ان کے ساتھ مقیم تھی۔ سونے سے پہلے میں مچھر دانی ٹھیک کر رہی تھی۔ کارمن پھر فرش پر آسن جمائے بیٹھی تھی۔

''نِک۔۔۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔

''آج کل کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔''

''تم اسے خط نہیں لکھتیں؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟'' میں نے حیرت سے سوال کیا۔

''تم خدا پر یقین رکھتی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ تو بہت لمبا چوڑا مسئلہ ہے۔'' میں نے جمائی لے کر جواب دیا۔۔۔ ''مگر یہ بتاؤ کہ تم اسے خط کیوں نہیں لکھتیں؟''

''پہلے میرے سوال کا جواب دو۔۔۔ تم خدا پر یقین رکھتی ہو؟''

''ہاں۔۔۔''میں نے بحث کو مختصر کرنے کے لیے کہا۔

''اچھا تو تم خدا کو خط لکھتی ہو؟''

عمارت کی روشنیاں بجھ گئیں۔رات کی ہوا میں آنگن کے درخت سرسرا رہے تھے،کمرے کے دروازے پر پڑا ہوا سرخ پھولوں والا پردہ ہوا کے جھونکوں سے پھڑ پھڑائے جا رہا تھا۔میں نے اٹھ کر اسے ایک طرف سرکا دیا۔

''بہت خوبصورت پردہ ہے۔''میں نے پلنگ کی طرف لوٹتے ہوئے اظہار خیال کیا۔کارمن فرش پر کروٹ بدل کر آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔میری بات پر وہ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔۔۔''میں اور نِک ایک مرتبہ پہاڑی علاقے میں کئی سو میل کی ڈرائیو کے لیے گئے تھے۔۔۔سن رہی ہو؟''

''ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔بتاؤ۔۔۔''

''راستے میں نِک نے کہا کہ چلو ڈون ریموں سے ملنے چلیں۔ڈون ریموں، نِک کے والد کے دوست اور کابینہ کے وزیر تھے اور انھوں نے حال ہی میں اپنے ضلع کے پہاڑی مقام پر نئی کوٹھی بنوائی تھی۔جب ہم لوگ ان کی کوٹھی کے نزدیک پہنچے تو سامنے سے سفید فراک پہنے بہت سی چھوٹی چھوٹی بچیاں ایک اسکول سے نکل کر آتی دکھائی دیں۔مجھے وہ منظر ایک خواب کی طرح یاد ہے۔پھر ہم لوگ اندر گئے اور مسز ریموں کے انتظار میں ان کے شاندار ڈرائینگ روم میں بیٹھے۔کیبنٹ منسٹر گھر پر موجود تھے۔ڈرائینگ روم اور اسٹڈی کے درمیان جو دیوار تھی اس میں شیشے کی ایک چوکور ڈبے ایسی کھڑکی میں پلاسٹ کی ایک بہت بڑی گڑیا سجی تھی جو کمرے کی نفیس آرائش کے مقابلے میں بہت بھدی معلوم ہو رہی تھی۔ہم دونوں اس بد مذاقی پر چپکے سے مسکرائے۔پھر مسز ریموں برآمد ہوئیں۔انھوں نے ہمیں ٹھنڈی چائے پلائی اور سارا گھر دکھایا۔ان کے غسل خانے سیاہ ٹائل کے تھے اور مہمان کمرے کے نفیس 'دیوان بیڈ' سرخ پھول دار ٹیپسٹری (Tapestry) کے جھالر والے غلافوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ان پلنگوں کو دیکھ کر نِک نے چپکے سے مجھ سے کہا تھا۔۔۔''بد مذاقی کی انتہا''اور میں نے اپنے دل میں کہا تھا۔۔۔کوئی بد مذاقی نہیں۔میں تو اپنے گھر کے لیے ایسے ہی پلنگ خریدوں گی اور اسی رنگ کے غلاف بنواؤں گی۔۔۔اس کے بعد۔۔۔میں جب بھی گھریلو ساز و سامان کی دکانوں سے گزرتی تو اس کپڑے کو دیکھ کر میرے قدم ٹھٹھک جاتے۔۔۔پھر میں نے تنخواہ میں سے بچا بچا کر اسی قیمتی کپڑے کا یہ پردہ خرید لیا۔۔۔''

’’جب میں ایک مخصوص چینی ریستوران کے آگے سے گزرتی ہوں۔۔۔‘‘ وہ اسی آواز میں کہتی رہی۔۔۔’’اور شیشے کے دریچے کے قریب رکھی ہوئی میز اور اس پر جلتا ہوا سبز لیمپ نظر آتا ہے۔وہاں میں نے ایک شام نِک کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔۔۔‘‘

مجھے نیند آرہی تھی اور میں نِک کے اس وظیفے سے اکتا چکی تھی۔ میں نے مچھر دانی کے پردے گراتے ہوئے کہا۔۔۔’’ایک بات بتاؤ۔تم کو اس قدر شدید عشق ہے اپنے اس نِک سے تو تم نے اس سے شادی کیوں نہ کر لی؟ اب تک کیوں جھک مارتی رہیں۔۔۔؟‘‘

’’مجھے دس سال تک ایک دور افتادہ جزیرے میں اپنے بابا کے ساتھ رہنا پڑا۔۔۔‘‘ اس نے اداسی سے جواب دیا۔’’پہلے ہم لوگ اسی شہر میں رہتے تھے۔ جنگ کے زمانے میں بمباری سے ہمارا چھوٹا سا مکان جل کر راکھ ہو گیا اور میری ماں اور دونوں بھائی مارے گئے۔صرف میں اور میرے بابا زندہ بچے۔ بابا ایک اسکول مین سائنس ٹیچر تھے۔ ان کو ٹی بی ہو گئی اور میں نے انھیں سینے ٹوریم میں داخل کروا دیا جو بہت دور کے جزیرے میں تھا۔۔۔ سینے ٹوریم بہت مہنگا تھا اس لیے کالج چھوڑتے ہی میں نے اسی صحت گاہ کے دفتر میں نوکری کر لی اور آس پاس کے دولت مند زمینداروں کے گھروں میں ٹیوشن بھی کرتی رہی، مگر بابا کا علاج اور زیادہ مہنگا ہوتا گیا۔تب میں نے اپنے گانو جا کر اناس کا آبائی باغیچہ رہن رکھ دیا۔تب بھی بابا اچھے نہ ہوئے۔ میں ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے تک کشتی میں بیٹھ کر جاتی اور زمینداروں کے محلوں میں ان کے کند ذہن بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے تھک کر چور ہو جاتی۔تب بھی بابا اچھے نہ ہوئے۔ نِک سے میری ملاقات آج سے دس سال قبل ایک فیسٹا (Fiesta) میں ہوئی تھی اسی دوران میں جب بھی میں دارالسلطنت آتی وہ مجھ سے ملتا رہتا۔تین سال ہوئے اس نے شادی پر اصرار کیا۔لیکن بابا کی حالت اتنی خراب تھی کہ میں ان کو مرتا چھوڑ کر یہاں نہ آسکتی تھی۔اسی زمانے میں نِک کو باہر جانا پڑ گیا۔ جب بابا مر گئے تو میں یہاں آ گئی۔اب میں یہاں ملازمت کر رہی ہو اور اگلے سال یونیورسٹی میں اپنا مقالہ بھی داخل کر دوں گی۔ مین چاہتی ہوں کہ بابا کے کھیت بھی رہن سے چھڑا لوں۔ نِک مدد کرنا چاہتا تھا مگر شادی سے پہلے اس سے ایک پیسا بھی نہ لوں گی۔اس کے خاندان والے بڑے بد دماغ اور اکڑفوں والے لوگ ہیں۔اور ایک لڑکی کے لیے اس کی عزت نفس بہت بڑی چیز ہے۔عزت نفس اور خودداری اور خود اعتمادی، اگر مجھے کبھی یہ احساس ہو جائے کہ نِک بھی مجھے حقیر سمجھتا ہے۔۔۔یا مجھے۔۔۔؟ سو گئیں۔۔۔؟ اچھا گڈ نائٹ۔۔۔۔۔۔۔‘‘

دوسرے روز صبح وہ تیار ہو کر حسب معمول سے سے پہلے ناشتے کی میز پر انتظام کے لیے پہنچ چکی تھی۔مسز سوریل گام واپس جارہی تھیں۔اپنے ہونے والے داماد سے ان کی صلح ہو گئی تھی۔وہ سویرے ہی سے آن پہنچا تھا۔وہ ایک مخنی سا

نوجوان تھا اور برآمدے کے ایک کونے میں بھیگی بلی بنا بیٹھا تھا۔ فضا پر عجیب سی بشاشت طاری تھی۔ لڑکیاں بات بات پر قہقے لگا رہی تھیں۔ میں بھی بہت مسرور تھی اور خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ یہ ہلکے پھلکے پن اور مکمل امن وسکون کا شگفتہ احساس زندگی میں بہت کم آتا ہے اور صرف چند لمحے رہتا ہے۔ مگر وہ لمحے بہت غنیمت ہیں۔

کارمن جلدی جلدی ناشتہ ختم کر کے دفتر چلی گئی۔

''آج بھی تم اپنے شاندار دوستوں سے ملنے نہ جاری ہوتیں تو تم کو جیپنی (Jeepney) میں بیٹھا کر شہر کے گلی کوچوں کی سیر کراتے۔۔۔'' مگدیلینا نے مجھ سے کہا۔

''تمھارے لیے ایک کیڈی لیکن آئی ہے بھئی۔۔۔'' روزا نے اندر آ کر اطلاع دی۔

''کیڈی لیک۔۔۔؟ افواہ۔۔۔'' کورس ہوا۔

''تمھارے لیے ایسی ایسی جغادری موٹریں آتی ہیں کہ ہم لوگوں کی رعب کے مارے بلکل گھگھی بندھ جاتی ہیں۔۔۔'' برنارڈا نے خوش دلی سے اضافہ کیا۔ میں نے لڑکوں کو خدا حافظ کہا اور اپنا سفری بیگ کندھے سے لٹکا کر باہر آ گئی۔ میں نے سابق سفیر ڈون گارسیا ڈیل پریڈوس کے ہاں دو دن کے لیے ان کے ہل اسٹیشن جا رہی تھی۔ ان کے وردی پوش شوفر نے سیاہ کیڈی لیکن کا دروازہ مودبانہ بند کیا اور کار شہر سے نکل کر سرسبز پہاڑوں کی سمت روانہ ہوگئی۔

پہاڑ کی ایک چوٹی پر ڈون گارسیا کا ہسپانوی وضع کا شاندار گھر درختوں میں چھپا دور سے نظر آ رہا تھا۔ وادیوں میں کہرا منڈلا رہا تھا اور سفید اور کاسنی اور سرخ اور زرد رنگ کے پہاڑی پھول سارے میں کھلے ہوئے تھے۔ کار پھاٹک میں داخل ہو کر پورچ میں رک گئی۔ قبائلی نسلوں والی شایستہ نوکرانیاں باہر نکلیں۔ بٹلر نے نیچے آ کر کار کا دروازہ کھولا۔ ہال کے دروازے میں ڈون گارسیا اور ان کی بیوی ڈونا ماریا میرے منتظر تھے۔ ان کا گھر سفید قالینوں اور سنہرے فرنیچر اور انتہائی قیمتی سامان آرایش سے سجا ہوا تھا اور اس طرح کے کمرے تھے جن کی تصویریں لائف میگزین کے رنگین صفحات پر 'پیریڈ فرنیچر' یا 'انٹر یرڈ یکوریشن' کے سلسلہ میں اکثر شائع کی جاتی ہیں۔

کچھ دیر بعد میں ڈونا کے ساتھ اوپر کی منزل پر گئی۔ وہاں شیشوں والے برآمدے کے ایک کونے میں ایک نازک سی بیڈ کی ٹوکری میں ایک چھ مہینے کی بے حد گلابی بچی پڑی غاؤں غاؤں کر رہی تھی۔ وہ بچی اس قدر پیاسی تھی کہ میں ڈونا ماریا کی بات ادھوری چھوڑ کر سیدھی ٹوکری کے پاس چلی گئی۔ ایک بے حسین، صحت مند، تر وتازہ اور کمسن امریکن لڑکی نزدیک کے صوفے سے اٹھ کر میری جانب آئی اور مسکرا کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''یہ میری بہو ہے۔۔۔'' ڈونا ماریا نے کہا۔

ہم تینوں ٹوکری کے گرد کھڑے ہو کر بچی سے لاڈ پیار میں مصروف ہو گئے۔

دوپہر کو لنچ کی میز پر امریکن لڑکی کا شوہر بھی آ گیا۔

''یہ ہمارا بیٹا ہوزے ہے۔۔۔'' ڈون گارسیا نے کہا۔

ہوزے کی عمر تقریباً پینتیس سال کی رہی ہوگی۔ اپنی قومی کڑھت کی ہلکے آبی رنگ کی قمیص اور سفید پتلون میں وہ خاصا وجیہہ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اپنی نوعمر بیوی کو بے انتہا چاہتا تھا اور بچی پر عاشق تھا۔ زیادہ تر وہ اسی کی باتیں کرتا رہا۔

رات کو میں اپنی بے حد پُرتکلف اور بڑھیا خواب گاہ میں گئی جس کے ساز و سامان کو ہاتھ لگاتے فکر ہوتی تھی کہ کہیں میلا نہ ہو جائے۔ اس وقت مجھے 'وائی ڈبلیو' کے سیلے ہوئے کمرے اور تنگ مچھر دانی اور مسز سوریل اور ہال کی بدرنگ میز کرسیاں شدت سے یاد آئیں۔

اپنے ماں باپ کو ان کے ٹاؤن ہاؤس میں اتارنے کے بعد ہوزے نے مجھے میری جائے قیام پر پہنچانے کے لیے کیڈی لک دوبارہ اسٹارٹ کی۔ ہوزے اور اس کی بیوی ڈوروتھی دو ہفتے قبل امریکا سے لوٹے تھے۔ ان کا بہت سامان کسٹم ہاؤس میں پڑا تھا جسے چھڑانے کے لیے انھیں جانا تھا۔

شہر کے سب سے اعلا ہوٹل کے سامنے ہوزے نے کار روک لی۔

''یہاں کیا کرنا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''تم یہیں ٹھہری ہو نا؟''

''نہیں ڈیر ہوزے۔ میں وائی ڈبلیو سی اے میں ٹھہری ہوں۔''

''وائی ڈبلیو۔۔۔؟ گڈ گاڈ۔۔۔ کمال ہے۔ اچھا، وہیں چلتے ہیں مگر کیا تم کو یہاں جگہ نہیں مل سکی؟ تمھیں چاہیے تھا کہ آتے ہی ڈیڈی کو اطلاع دیتیں۔۔۔

اس وقت مجھے دفعتاً خیال آیا کہ میں ہر طبقے اور ہر قسم کے لوگوں کو اپنی افتادِ طبع کے ذریعے کم از کم اپنی حد تک ذہنی طور پر ہموار کرتی چلی جاتی ہوں مگر ہوزے اور اس کے والدین اس ملک کے دس دولت مند ترین خاندانو میں شامل تھے اور یہاں کے حکمران طبقے کے اہم ستون تھے اور ان لوگوں کو یہ سمجھانا بلکل بے کار تھا کہ مجھے وائی ڈبلیو کیوں اتنا اچھا لگا ہے اور اس میں وہاں ٹھہرنے پر کیوں اس قدر مصر ہوں۔

ہوزے نے گلی کے نکڑ پر کار روک لی۔ کیونکہ 'جیپنیوں' کی قطار نے سارا راستہ گھیر رکھا تھا۔ میں جب وائی ڈبلیو کے اندر پہنچی تو سب لوگ سو چکے تھے۔ میں چپکے سے جا کر اپنی مچھر دانی میں گھس گئی۔ کارمن حسبِ معمول فرش پر سکون کے ساتھ سو رہی تھی۔ اس کے سرہانے سانتو طوماس (سینٹ طامس) کی تصویروں پر گلی کے لیمپ کا مدھم عکس جھلملا رہا تھا۔

صبح چار بجے اٹھ کر میں دبے پانو میں چلتی شکستہ غسل خانے میں گئی اور آہستہ سے پانی کا نل کھولا۔مگر پانی کی دھار اس زور سے نکلی کہ میں چونک اٹھی۔اسی طرح چپکے چپکے کمرے میں آکر میں نے اسباب باندھا تاکہ آہٹ سے کارمن کی آنکھ نہ کھل جائے۔اتنے میں میں نے دیکھا کہ وہ فرش پر سے غائب ہے۔

کچھ دیر بعد اس نے آکر کہا۔۔۔''ناشتہ تیار ہے۔''وہ ٹیکسی کے لیےفون بھی کر چکی تھی۔

''کیسا سفر رہا۔۔۔؟اس نے چائے انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

''بہت دل چسپ۔''

''یہ تمھارے دوست لوگ کون تھے،جہاں تم گئیں تھیں۔۔۔؟تم نے بتایا ہی نہیں۔''

میں بات شروع کرنے ہی والی تھی کہ۔۔۔اچانک ایک خیال آیا۔میں نے جلدی سے کمرے میں جاکر سوٹ کیس کھولا۔ایک نئی بنارسی ساری نکال کر ایک پرچے پر لکھا۔۔۔''تمھاری شادی کے لیے میرا پیشگی تحفہ۔۔۔''اور ساری اور پرچہ کارمن کے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔

''ٹیکسی آگئی۔۔۔''کارمن نے برآمدے میں سے آواز دی۔

ہم دونوں سامان اٹھا کر باہر آئے۔میں ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔اتنے میں کارمن پھاٹک کی کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر چلائی۔۔۔''ارے تم نے اپنا پتہ تو دیا نہیں۔۔۔''میں نے کاغذ کے ٹکڑے پر اپنا پتا گھسیٹ کر اسے تھما دیا۔پھر مجھے بھی ایک بے حد ضروری بات یاد آئی۔۔۔''حد ہوگئی کارمن۔تمھاری وائی ڈبلیو نے مجھے اپا بل نہیں دیا۔''

''بکومت۔۔۔''

''ارے یہ تمھارا نجی گھر تو نہیں تھا۔''

''تم میری مہمان تھیں۔''

''بکومت۔۔۔''

''تم خود مت بکو۔اب بھاگو ورنہ ہوائی جہاز چھوٹ جاۓ گا۔اور دیکھو،جب میں شادی کا کارڈ بھیجوں تو تم کو آنا پڑے گا۔میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔ذرا سوچو،نک تم سے مل کر کتنا خوش ہوگا۔۔۔''

مگر ہم دونوں کو معلوم تھا کہ میرا دوبارہ اتنی دور آنا بہت مشکل ہے۔

''خدا حافظ کارمن۔۔۔''میں نے کہا۔

''خدا حافظ۔۔۔''وہ کھڑکی میں سے سر نکال کر بہت دیر تک ہاتھ ہلاتی رہی۔ٹیکسی صبح کاذب کے دھندلکے میں ایئر پورٹ روانہ ہوگئی۔

ہوائی جہاز تیار کھڑا تھا۔ میں کسٹم کاؤنٹر سے لوٹی تو پیچھے سے ڈون گارسیار کی آواز آئی۔۔۔ ’’نِک میں ذرا سگار خرید لوں۔‘‘

’’بہت اچھا ڈیڈی۔۔۔‘‘ یہ ہوزے کی ~~آواز تھی۔~~

میں چونک کر پیچھے مڑی۔ ہوزے مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا۔۔۔ ’’دیکھا ہم لوگ کیسے ٹھیک وقت پر پہنچے۔‘‘

’’ہوزے۔۔۔۔‘‘ میں نے ڈوبتے ہوئے دل سے پوچھا۔۔۔ ’’تمھارا دوسرا نام کیا ہے؟‘‘

’’نک۔۔۔ ڈیڈی جب بہت لاڈ میں آتے ہیں تو مجھے نِک پکارتے ہیں ورنہ عام طور پر میں ہوزے ہی کہلاتا ہوں، کیوں۔۔۔۔؟‘‘

’’کچھ نہیں۔۔۔‘‘ میں اس کے ساتھ ساتھ لاؤنج کی طرف چلنے لگی۔ ’’تم امریکا کیا کرنے گئے تھے؟‘‘ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

’ہارٹ سرجری میں اسپشلائز کرنے۔۔۔ تمھیں بتایا تو تھا کیوں۔۔۔؟‘‘

’’تم۔۔۔۔ کبھی تم نے۔۔۔۔ تم نے۔۔۔‘‘

’’کیوں۔۔۔؟ کیا ہوا۔۔۔؟ کیا بات ہے؟‘‘

’’کچھ نہیں۔۔۔‘‘ میری آواز ڈوب گئی۔ لاؤڈ اسپیکر نے یکسانیت سے دہرانا شروع کیا۔۔۔ ’’پین امریکن کے مسافر۔۔۔ پین امریکن کے مسافر۔۔۔۔‘‘

’’ارے۔۔۔ روانگی کا وقت اتنی جلدی آ گیا؟‘‘ نِک نے تعجب سے گھڑی دیکھی۔ ڈون گارسیار خرید کر شفقت سے مسکراتے ہوئے میری طرف آئے، میں نے دونوں باپ بیٹوں کا شکریہ ادا کیا۔ انھیں خدا حافظ کہا اور تیزی سے مسافروں کی قطار میں جا ملی۔

دوڑتے ہوئے طیارے کی کھڑکی میں سے میں نے دیکھا۔ ڈون گارسیا اور نِک نیچے ریلنگ پر جھکے رومال ہلا رہے تھے۔ طیارے نے زمین سے بلند ہونا شروع کر دیا۔

یہاں سے بہت دور، خطرناک طوفانوں سے گھرے ہوئے پوربی سمندر میں ہرے بھرے جزیروں کا ایک جھنڈ ہے جو فلپائن کہلاتا ہے۔ اس کے جاگتے جگمگاتے دارالسلطنت کے ایک بے رنگ سے محلے کی ایک شکستہ عمارت کے اندر ایک بے حد چپٹی ناک اور فرشتے کے سے معصوم دل والی فلپنو لڑکی رہتی ہے جو اپنے بچے کے لیے کھلونے جمع کر رہی ہے اور اپنے خدا کی واپسی کی منتظر ہے جس کی ذات پر اسے کامل یقین ہے۔

☆☆☆

سید احتشام حسین

یہ لندن ہے

۲۸ / مارچ سنیچر: ۔اور یہ لندن ہے! اس لفظ میں کتنی داستانیں رنگین اور خونیں کہانیاں، تہذیبی مرقعے، تاریخی واقعات، شعر وادب کے خزانے پوشیدہ ہیں۔ اس لفظ سے کتنی باتیں، کتنی یادیں متعلق ہیں۔ اسے تو خاص نظر سے دیکھنا ہے، لندن کو، دنیا کے سب سے بڑے شہر کو جس کی رونق اور گرم بازاری میں ہمارا لہو بھی صرف ہوا ہے۔

کل ساؤتھ ہمپٹن سے لندن آتے ہوئے یہ احساس ہوا کہ انگلستان کی ریلیں امریکا کے مقابلے میں چھوٹی ہیں اور کم رفتار، ممکن ہے اور علاقوں میں یہ بات نہ ہو۔ والٹرلو پہنچا تو اسٹیشن پر آلِ حسن مع کرشنا (بیوی) اور ربن (بہن) کے موجود تھے۔ مانوس چہروں نے مانوس فضا پیدا کر دی اور وہ تحیر جو ایک نئی جگہ اور اتنی بڑی جگہ پہنچ کر ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہوا۔ شاید اس کا سبب یہ بھی ہو کہ نہ جانے کب سے لندن کے متعلق پڑھتے اور سنتے چلے آئے ہیں۔ سڑکوں کے نام اور عمارتوں کی تصویریں بچپن سے دیکھ رہے ہیں۔ بہر حال ہوا یہی کہ لندن کا پہلا اثر بہت اجنبی نہیں تھا۔ لندن اپنے موسم سے بھی پہچانا جاتا ہے لیکن کل یہاں دھوپ تھی۔ ہائڈ پارک کے خزاں زدہ درختوں میں کہیں کہیں ہری کونپلیں نظر آ رہی تھیں۔ بعض سڑکوں کے کنارے لکڑی اور لوہے کے ڈھانچے کھڑے کیے جا رہے ہیں کہ جشن تاجپوشی قریب ہے۔ یہ بھی کیسا اتفاق ہے کہ امریکہ پہنچا تھا تو صدر کے انتخاب کا ہنگامہ بپا تھا، یہاں آیا ہوں تو تاجپوشی کا غوغا تھا۔ ہاں وقتی طور پر کوئین میری کے انتقال نے ساری توجہ ان کے جنازے کی طرف موڑ دی ہے۔ ہماہمی وہی ہے۔ سچ کہا ہے غالب نے ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

کل کہیں نہیں نکلا، آج چند سڑکوں پر پھرا، 'بی بی سی' کے دفتر گیا اور وہاں بعض ہندوستانی پاکستانی احباب سے ملاقات بھی ہوئی۔

۳۰ / مارچ دوشنبہ : ۔ موسم بہار آنے کے ساتھ ساتھ یہ کیسی خوشگوار صدائیں آ رہی ہیں۔ ان خبروں کا خیر مقدم کس طرح کیا جائے! ہر طرف سے امن امن کی آواز اٹھ رہی ہے۔ چین، روس اور دوسرے امن دوستوں نے امن کی فضا پیدا کرنے کے لیے جو قدم اٹھائے ہیں ان کا اثر سامراجی اور سرمایہ دار ملکوں پر بھی معلوم ہوتا ہے۔ بہت دنوں سے میں یہی سوچتا رہا ہوں کہ دنیا کے عوام کو متاثر کرنے اور سرمایہ دار ملکوں کو آزمانے کے لیے اس اقدام کی شدید ضرورت ہے۔ امن دوستوں کو وہ

سب کچھ کرنا چاہیے جس کے بعد جنگ جوئی کی خواہش کا دھبہّ سرمایہ دار ملکوں کے دامن سے دھویا نہ جاسکے یا پھر وہ امن کی فضا قائم رکھنے پر مجبور ہو جائیں۔ یقیناً انسان اجتماعی طور پر چاہیں تو امن قائم ہوسکتا ہے اور دنیا جنت بن سکتی ہے۔

انڈیا ہاؤس گیا۔ شاندار عمارت ہے اور بہت بڑا دفتر۔ انور جمال قدوائی اور فیروز جبیں سے ملاقات کی۔ پکیڈلی سرکس جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ تھوڑی دیر یہاں کھڑے رہو تو جس سے ملنا ہے وہ ضرور یہاں سے گزرے گا۔ کوئی خاص بات نہیں بس قدیم مرکزی جگہ ہے اور بڑی بارونق۔ عشق کے دیوتا (Eros) کا مجسمہ جو صاف کرنے کے لیے اتارا گیا تھا، اپنی کمان کے ساتھ پھر اپنی جگہ پر پہنچ گیا ہے۔ ٹریفالگر اسکوائر میں پھرا، تصویر کھینچنے والے تصویر کھینچ رہے ہیں، کبوتروں سے دلچسپی لینے والے انھیں اپنے سر اور کندھوں پر بٹھا رہے ہیں۔ بڑے بڑے چار شیر نلسن کالم کی حفاظت کر رہے ہیں اور تیز ہوا فواروں کے پانی اڑا کر تفریح کرنے والوں کے شوق کا امتحان لے رہی ہے۔ قریب ہی اور بہت سے مجسمے، تاریخی عمارتیں اور اہم جگہیں ہیں۔ پاس ہی نیشنل گیلری آف آرٹس ہے، اسے تو اطمینان سے دیکھوں گا، لندن کو پہنچاننے اور اس لطف اندوز ہونے کے لیے اس سے مانوس ہونے اور اسے پرچانے کی ضرورت ہے۔ موسم عجیب ہے، دھوپ چھانو، تیز دھوپ، گہرے بادل، ہلکی بارش، سرد ہوا۔

آج ہی ہندوستان کے مشہور فلم ڈائرکٹر سہراب مودی سے ملاقات ہوئی۔ آلِ حسن نے کھانے پر بلایا تھا۔ آدمی دلچسپ ہیں۔ انا کا زور کسی قدر زیادہ ہے۔

یکم اپریل بدھ:- پڑا پڑا باتیں کرتا ہوں، تھکن مٹانے کے نام پر کاہلوں کی طرح آرام کر رہا ہوں۔ فرید جعفری میرے بچپن کے دوست ہیں، کل ان سے ملنے کا وعدہ کیا تھا نہیں گیا۔ یہ میری عادت نہیں لیکن بارش کے بہانے کاہل بن جانے کا کیا علاج! کچھ خط لکھے، کچھ پڑھتا رہا، ابھی یہ اندازہ نہیں کہ یہاں کس کس سے ملنا ہے، کہاں کہاں کس سے ملنا ہے، کہاں کہاں جانا ہے اور کیا کیا دیکھنا ہے۔ طبیعت گھبراتو نہیں رہی ہے لیکن کوئی زبردست ولولہ بھی نہیں ہے کہ تھوڑے وقت میں بہت کچھ کر ڈالوں۔

آج ٹہلنے نکلا تو اس حصے میں پہنچ گیا جس کی سڑکوں کے نام انگریزی ادب میں زندہ ہیں۔ ریجنٹ اسٹریٹ، آکسفرڈ سرکس، اسٹرینڈ، چیرنگ کراس اور سب سے بڑھ کر فلیٹ اسٹریٹ، جس پر اس وقت یہاں کے تقریباً سبھی اخباروں کے دفتر ہیں۔ اسی پر وہ جگہ ہے جہاں ڈاکٹر جانسن اور ان کے دوست اکٹھا ہوکر علم وادب کے گل کھلاتے تھے۔ قریب ہی ان کا مکان بھی ہے جو زیارت گاہِ عالم بنا ہوا ہے۔ بی بی سی کے دفتر پہنچا قرۃ العین حیدر، صدیقی، محمد علی خاں ملیح آبادی (جو مدتوں سے لندن میں مقیم ہیں)، ساجد علی راز، یاور عباس وغیرہ سے ملاقات ہوگئی۔ قرۃ العین کی گفتگو ان کے

پچھلے افسانوں سے بہت مختلف معلوم ہوئی۔

۱۳/اپریل جمعہ:۔ کل لندن سٹی کے علاقے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ گذشتہ جنگ کی بہیمانہ بمباری کے نشانات کھنڈروں کی صورت میں اب بھی موجود ہیں اور بہت ہیں۔ تعمیر کا کام تیز رفتار نہیں معلوم ہوتا۔ یوں تو بعض اوقات سارا شہر دھوئیں میں جھلسا ہوا اور بم زدہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس علاقے میں پہنچ کر اس کا زیادہ احساس ہوا۔ قریب ہی بڑے بڑے انگریزی اور غیر ملکی بینک ہیں اور کچھ دور ہٹ کر سینٹ پال کا مشہور گرجا گھر۔ مکانوں اور گلیوں کے ہجوم میں دبے ہوئے ہونے کے باوجود نمایاں۔ انگریزی شہنشاہیت کے لیے جان دینے والوں کے مجسمے اس کے نوادر میں سے ہیں۔ گنبد کا حسن اور نقاشی کے نمونے سرسری نگاہ سے دیکھنے والوں کو بھی متوجہ کرتے ہیں۔ اس کی تعمیر تو اٹھارویں صدی کے ابتدائیہ حصے میں نشاۃ الثانیہ کے تعمیری اصولوں کے مطابق سر کرسٹوفر رن نے کی تھی لیکن اس کی آرایش میں ڈھائی صدیوں کے انگریزی صناعوں اور فن کاروں کا ہاتھ ہے۔

ایک صاحب ہیں ڈاکٹر مارس کارسیڑس، انھیں امریکا سے میرے آنے کی اطلاع مل گئی تھی وہ ملنا چاہتے تھے۔ آج دوپہر کو ان کے ساتھ کھانا کھایا، ہندوستان میں رہ چکے ہیں، ہندوستانی بول لیتے ہیں، تخیل نفسی کے طریقۂ علاج سے دلچسپی لیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی گفتگو سے کچھ ایسا متاثر نہیں کیا گو آدمی اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی ایک عزیز ادھیڑ عمر کی خاتون نے پوچھا، ''آپ نے ملکہ 'میری' کا جنازہ بھی دیکھا؟'' میں نے افسوس کا اظہار کیا۔ کہنے لگیں: ''دیکھ لینا چاہیے تھا، ایسے مواقع زندگی میں کم آتے ہیں۔'' میں نے سوچا تو اس میں واقعی سچائی نظر آئی اور انگریزی ذہن کا کچھ بھید بھی کھلا۔

انور انصاری صاحب مع اپنی اہلیہ کے آ گئے، دیر تک امریکا کے تجربات اور تاثرات، ادب اور نفسیات کے متعلق باتیں ہوئیں۔ سوچتا ہوں تو روح کانپ جاتی ہے کہ یہ باتیں کب تک اور کہاں کہاں دہرانی پڑیں گی!

۱۵/اپریل اتوار:۔ کل گھر ہی پر پڑا رہا۔ دوپہر کو غوث انصاری آ گئے، وہ گئے تو ڈاکٹر عمار حسین۔ سہ پہر کے بعد انھوں نے اپنی کار میں لندن کی بیرونی مغربی حدوں کی سیر کرا دی۔ رات کا کھانا فرید کے باوجود مخلصانہ۔ ابھی بار بار ملیں گے۔ بیگم فرید کی خاطر داری فرید کی محبت سے ہم آہنگ تھی۔ فرید بچپن کے دوست ہیں اور میرے مضمون نگار بننے کے شوق میں ان کی ترغیبات شامل ہیں۔

آج کٹی پتنگ کی طرح لندن کی سڑکیں ناپتا رہا، ہلکی بارش اور تیز ہوا کے باوجود گھر میں نہ رہا گیا۔ کوئی خاص چیز نہیں دیکھی لیکن ہائڈ پارک کے مختلف حصوں کی سیر کی اور اس مشہور Speaker's اور سننے والے کسی کو محروم نہیں رکھتے۔ تین چار ٹولیوں میں مختلف عیسائی مشنوں کے پادری دھمکیاں اور مشاق اور روادار ہونا چاہیے کیونکہ مجمع کے لوگ ہر قدم پر

ٹوکتے اور فقرہ بازی کرتے ہیں۔

اس وقت اخباروں میں، راستہ چلتے ہوئے لوگوں میں، جلسوں میں یہی ذکر کو ہے کہ روس نے ان ڈاکٹروں کو چھوڑ دیا جن پر روسی رہنماؤں کے قتل کی سازش کا الزام تھا۔ روسی رہنماؤں نے کچھ بھی نہیں چھپایا۔۔۔ طرح طرح کی حاشیہ آرائیاں ہو رہی ہیں اور مجھے حیرت ہے کہ اگر یہ بات معلوم ہوگئی کہ وہ ڈاکٹر بے قصور ہیں اور انھیں رہا کر دیا گیا تو اس سے ڈرنے اور اُلجھنے کی کیا بات ہے۔ انگلستان اور امریکا کے اخبار اس کے متعلق کچھ نہیں لکھتے کہ روس ضروری چیزوں کی قیمتیں گھٹ رہی ہیں اور اس کے برعکس دوسری جگہوں پر۔۔۔؟

۷/اپریل منگل:۔ لندن کا جادو مجھ پر کام کرنے لگا ہے۔ مجھے یہاں کی عمارتیں خوبصورت معلوم ہو رہی ہیں، سڑکوں پر چلتی ہوئی عورتوں کا حسن انھیں کئی بار دیکھنے کی خلش پیدا کرتا ہے، پارک دلکش ہیں، گلیوں کے پیچ و خم اچھے معلوم ہوتے ہیں، سڑکوں کے ان جانے موڑ پر پہنچ کر اچانک کسی تاریخی عمارت یا مجسمہ کا نظارہ دلفریب ہے۔ اب نگاہیں بعض علاقوں سے مانوس ہو رہی ہیں۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ لندن کی اصل کشش کا راز دریافت کرنے میں وقت لگے گا۔ خبر نہیں میرے اور اس کے درمیان کون سے حجاب حائل ہیں اور کتنے!

آج میں نے سارا اس دن کتابوں کی دکانیں میں صرف کیا۔ فوائلس، جسے دنیا کی سب سے بڑی کتابوں کی دکان کہا جاتا ہے، واقعی بڑی ہے۔ سکنڈ ہینڈ کتابیں زیادہ ہیں مگر کچھ بے ترتیبی سی معلوم ہوتی ہے۔ نیو یارک میں اسکرنبر، ڈبل ڈے اور یورنٹونو کی دکانیں بھی بہت بڑی تھیں۔ کون سب سے بڑی ہے، میں نہیں کہہ سکتا! مغربی لندن میں گولڈ ہاک روڈ پر مقیم ہوں اور آرام سے ہوں۔ دن تو زیادہ تر گھومنے پھرنے میں گزر جاتا ہے۔ رات کے وقت کوئی آجائے تو دلچسپ منظر دیکھیے۔ سیاسیات، سینما، لندن، لکھنو، پیرس، امریکا اور بی بی سی کی باتیں ہوتی ہیں، چھوٹی چھوٹی بحثیں اور بڑے بڑے فیصلے جو ہنسی مذاق کی نذر ہو جاتے ہیں، کبھی غالب کا دیوان کھلتا ہے اور بارہ بجے رات تک وہ شمعِ محفل بنتا ہے اور پھر جماہیوں اور تھکے ہوئے بوجھل پپوٹوں کے ساتھ اپنے اپنے بستروں کی راہ لیتے ہیں۔

۸/اپریل:۔ ناشتہ کر کے نکل پڑا کہ برٹش میوزیم دیکھوں گا۔ بارش راستہ کاٹتی رہی، کتابوں کی دکانیں دامن گیر ہوتی رہیں پھر بھی میں چکر کھاتا ہوا بلومسبری پہنچ گیا۔ برٹش میوزیم کی وسیع اور پہاڑ کی طرح کھڑی عمارت نے خود متوجہ کیا، قبل اس کے کہ میں اس میں داخل ہوں، میں نے اس کے گرد و پیش کا چکر لگایا، یہ رسل اسکوائر ہے، وہ یونیورسٹی کی عمارت، یہ لندن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز ہے، وہ آگے یونیورسٹی ہال اور نہ جانے کہاں سے یکا یک نگاہوں کے

سامنے سے سجاد ظہیر کے ناول 'لندن کی ایک رات' کے صفحات کھل گئے اور ذہن دور دور بھٹکنے لگا۔ بہت سے ہندوستانی طلبہ آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں، معلوم نہیں ان کے سینوں میں بھی کوئی آگ بھڑک رہی ہے یا نہیں، چہرے تو کچھ نہیں بتاتے! نہیں مجھے برٹش میوزیم پلٹ چلنا چاہیے، سوچنے کے لیے تو وقت پڑا ہے۔ دور کھڑے ہو کر میں نے اس کی وسعت کا اندازہ لگایا، سامنے اونچے برآمدے کی منڈیر پر بنے ہوئے سنگی مجسموں کو دیکھا جو یونانی اور رومن انداز میں علم و فن کی علامتیں ہیں۔ کچھ لوگ برآمدے میں بنچوں پر بیٹھے ہوئے کھا پی رہے ہیں یا اخبارات دیکھ رہے ہیں۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ خوشی اور حیرت کا عجیب جذبہ مجھ پر طاری ہے اور یہ خوف سا کیوں ہے؟ میرا دل کیوں دھڑک رہا ہے؟ بڑے ہال میں ابھی صرف ایک طرف ہندوستانی مجسمے اور دوسری طرف یونانی اور رومی مجسمے دکھائی دے رہے ہیں۔ مگر میں تو اس کشمکش میں ہو کہ کیا دیکھوں اور کس طرح! گھنٹہ بھر تک انھیں کو دیکھتا رہا، تصویروں کے چند کارڈ خریدے، داہنی جانب ایک نمایش گاہ میں گیا جہاں اہم لوگوں کے دستخطی خطوط، مسودات اور قدیم کتابوں کے نایاب نسخے رکھے ہوئے ہیں، کچھ وقت وہاں گزارا اور یہ سوچ کر واپس آیا کہ اس میوزیم کے متعلق کچھ پڑھ لوں گا، اس کے نقشے کو سمجھ لوں تو پھر آؤں گا۔ سب کچھ دیکھنا تو محال ہے۔ مجھے گھبراہٹ کیسی ہے؟ کمتری کا احساس کیوں ہے؟ پسپائی سی کیوں محسوس کر رہا ہوں؟ علم کم ہے تو کیا، اس کی پیاس تو بہت ہے، پھر آؤں گا۔

۱۰/اپریل جمعہ:۔ کچھ نہیں، اِدھر اُدھر کے چکر ہیں اور میں۔ بہت کچھ دیکھ رہا ہوں اور بہت کچھ دیکھنا ہے۔ یہاں کے اخبار مجھے زیادہ پسند نہیں آتے، سبھی دیکھ لیے، بہت سی الجھنوں اور تاریکیوں کے درمیان یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ امن اور ترقی کی قوتیں مضبوط ہوتی جا رہی ہیں۔ اس وقت شاید افریقا کی باری ہے، اس کے ہر گوشے میں ہیجان ہے۔ اس اندھیرے ملک میں بھی تو صبح کے پجاری موجود ہیں۔

بی بی سی میں ہندوستان سکشن کے انچارج مسٹر جے لنٹن ہیں، ان سے ملا۔ ہندوستان کے لسانی ادبی اور سماجی مسائل کے متعلق باتیں ہوئیں۔ بی بی سی کے ہندوستانی پروگرام کا تذکرہ آیا۔ باتیں یونہی سی رہیں۔ انھوں نے کل انڈیا آفس لائبریری لے چلنے کا وعدہ کیا ہے۔ صورت یہ ہے کہ یہاں ایک انڈیا کلب ہے، اس کی طرف سے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ کچھ لوگ باقاعدہ اس نادر ذخیرے کو دیکھ سکیں۔ ضرور جاؤں گا۔

۱۱/اپریل سنیچر:۔ انڈیا آفس لائبریری کا شوق گیارہ بجے وہائٹ ہال کی سڑکوں پر لے گیا، کبھی یہیں سے ساری دنیا کی نبضیں دیکھی جاتی تھیں۔ یہ ۱۰/ڈاؤننگ اسٹریٹ ہے، بلکل غیر مرعوب کن، یہ انڈیا آفس ہے، اب اسے کامن ویلتھ ریلیشنس آفس کہتے ہیں، اور یہ لارڈ کلایو کا مجسمہ ہے۔ کئی ہندوستانی اور انگریز اکٹھا ہو گئے، مسٹر لنٹن بھی آ گئے اور ہم لوگ انڈیا آفس میں داخل ہوئے۔ کیسی بڑی، پیچیدہ اور مضبوط عمارت ہے، مختلف راہوں سے گزرتے ہوئے ہر طرف

کتابوں کے ڈھیر، تصویریں، مجسمے نظر آرہے ہیں، پھر لائبریری کا اصل حصہ ملتا ہے، کتابوں کا، تصاویر اور نوادر کا کتنا بڑا ذخیرہ ہے! خدا کی پناہ! کوئی زمانے یا نہ زمانے، میرے دل میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ یہاں یہ چیزیں محفوظ ہیں۔ اگر ہندوستان میں ہوتیں تو اب تک کب کی تباہ ہو چکی ہوتیں۔ کیا دیکھوں اور کیا نہ دیکھوں۔ دو صدیوں میں ہر طرف سے مخطوطات اور مرقعے سمٹ کر یہاں آئے ہیں۔ اور یہ تو محض ایک مرکز ہے، ایسی نہ جانے کتنی جگہیں ہیں۔ جن لوگوں نے انفرادی طور پر یہ چیزیں ہندوستان میں حاصل کیں انھوں نے یا تو ہدیتاً دے دیں یا بیچ دیں۔ خود اس کائبریری کا سلسلہ ۱۸۰۱ء میں شروع ہوا تھا۔ اس وقت اس میں تقریباً ڈھائی لاکھ مطبوعہ کتابیں اور اکیس ہزار مخطوطے ہیں۔ بیس ہزار مشرقی مخطوطوں کے علاوہ اصل ہندوستانی اور ایرانی تصاویر ڈیڑھ ہزار کی تعداد میں ہیں۔ مخطوطوں میں سب سے بڑی تعداد سنسکرت کی ہے، آٹھ ہزار تین سو، اس کے بعد فارسی چار ہزار آٹھ سو، عربی تین ہزار دو سو، اردو دو سو ستّر اور ہندی ایک سو آٹھ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دوران کی خط کتابت، ضروری کاغذات نجی روز نامچے نہ جانے کتنے ہیں۔

وقت بہت کم ہے اور دیکھنا بہت، میں نے شاہنامہ، کلیات اہل شیرازی، پدماوت (ہندی رسم خط) وغیرہ جلد جلد دیکھ کر اس البم کو ہاتھ لگایا، جو داراشکوہ نے اپنی محبوب بیوی کے لیے تیار کرایا تھا۔ اسکا حسن بیان کرنے کے لیے مجھے الفاظ نہیں ملتے، تصویریں بھی ہیں اور وصلیاں بھی، زرکار، منقش، رنگین اور مرصع۔۔۔ ہر تصویر دیر تک جانے کی ہے۔ مغل مصّوری اور راجپوت مصّوری کے اتنے حسین اور بہت سے مرقعے میں نے کہیں نہیں دیکھے۔ دیکھا ہے کہ تقسیم کے بعد یہ خزانہ ہندوستان کو ملتا ہے یا پاکستان کو۔ شاید پاکستان داراشکوہ سے دلچسپی نہ لے! مطبوعہ اردو کتابوں کا بھی بڑا ذخیرہ ہے۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ کئی دن یہاں آؤں گا اور جو کچھ دیکھ سکوں گا، دیکھوں گا۔ لائبریری سے نکل کر دوپہر کا کھانا سب کے ساتھ انڈیا کلب میں کھایا۔

رات کا کھانا انور انصاری کے یہاں تھا۔ بیگم انصاری نے اتنا اہتمام کیا تھا اور اتنے آدمی بلا لیے تھے کہ فرنگی محل کی روایات لندن میں تازہ ہو گئیں۔ نام کی مناسبت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ کس کس کے نام لکھوں، سبھی تھے۔ ایسے ایسے لوگ جن کے موجود ہونے کا گمان بھ نہیں تھا۔ اور ایسی بے تکلف فضا جو ہم زبان اور ہم خیال قسم کے لوگوں کے یکجا ہونے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

☆☆☆

پروفیسر نور العین علی

منزل کہاں ہے تیری

کردار

۱) کمل ۲) سریتا

۳) اجے کمار ۴) شرد

۵) ماں ۶) پرکاش

۷) چپراسی

(چپراسی تین حصوں میں تقسیم کیا جائے۔جس حصّے کا منظر ہو وہاں روشنی ہو اور باقی دو حصے اندھیرے میں ہوں۔)

پہلا حصہ: آفس کا ایک کونا۔دو میزیں،ایک پر ٹائپ رائٹر اور کچھ کاغذات،دوسری پر فائلیں۔دو کرسیاں۔پہلے، تیسرے اور پانچویں منظر میں یہ حصّہ روشن رہے گا۔

دوسرا حصہ: آفس کے پاس اجے کمار کا کمرہ۔ایک بڑی سی میز۔اُس پر ٹیلی فون۔کاغذات،قلمدان وغیرہ۔آرام دہ کرسی،سامنے اور دو کرسیاں۔دوسرے منظر میں یہ حصہ روشن رہے گا۔

تیسرا حصہ: کمل کے گھر کا کمرہ۔ایک طرف لکڑی کی دو کرسیاں،ایک کا ہتھا ٹوٹا ہوا۔میز پر ا کچھ کتابیں۔ڈبے اور ایسا ہی سامان بے ترتیب پڑا ہے۔ایک کونے میں بان کی چارپائی پر ملگجا سا بستر ہے۔چوتھے منظر میں یہ حصّہ روشن رہے گا۔)

پہلا منظر

(کمل ٹائپ کر رہی ہے۔ دوسری میز پر سریتا ایک فائل پڑھ رہی ہے۔ ایک کاغذ پر کچھ لکھتی جاتی ہے۔ شرد آتا ہے۔)

شرد : کمل جی۔ نمستے۔ کیسی ہیں آپ؟

کمل : (ٹائپ رائٹر پر سے نظریں ہٹائے بغیر) نمستے۔ اچھی ہوں۔

شرد : کمل جی۔ آپ مجھے ذرا سا ٹائم دے سکیں گی؟

کمل : میں ۔۔۔؟ آپ کو ٹائم دوں ۔۔۔؟ کس لیے ۔۔۔؟

شرد : ایک کام ہے آپ سے۔

کمل : کہیے۔

شرد : ذرا امپورٹمنٹ بات ہے۔ آپ ٹائپنگ بند کریں اور دھیان سے سُنیں تو کہوں۔

کمل : ٹائپنگ کرتے ہوئے بھی میں دھیان سے سُن سکتی ہوں۔

شرد : اچھا خیر ۔۔۔ یہی سہی ۔۔۔ دیکھیے بات یہ ہے کہ اگلے مہینے شرما جی ریٹائر ہو رہے ہیں۔

کمل : مجھے بھی معلوم ہے۔

شرد : جی ہاں۔ آپ کو تو معلوم ہونا ہی ہے۔ آخر آپ بوس کی پی۔ اے۔ ہیں۔

کمل : (ذرا چڑک کر زور سے بولتی ہے) باس کی پی۔ اے ہونے سے اس کا کیا تعلق پورے آفس کو معلوم ہے یہ بات!

شرد : ارے ارے آپ تو ناراض ہونے لگیں۔ میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا۔ اصل بات تو کچھ اور ہے۔ (کمل جواب نہیں دیتی۔ ٹائپ کر رہی ہے) تو بات یہ ہے کہ کمل جی۔ (کمل ٹائپنگ میں مصروف ہے) آپ سنتی تو ہیں نہیں، ٹائپنگ کیے جا رہی ہیں۔

کمل : (ٹائپ رائٹر پر سے انگلیاں ہٹا کر، بہت بے زاری سے) اچھا لیجیے بند کر دی ٹائپنگ۔ اب جلدی سے جو کچھ کہنا ہے کہہ دیجیے۔ مجھے بہت ضروری لیٹر ٹائپ کر کے ابھی باس کو لے جا کر دینا ہے۔

شرد : جی بس وہی تو کہہ رہا ہوں کہ جب آپ باس کے پاس جائیں تو ۔۔۔ (رک جاتا ہے۔ ادھر اُدھر دیکھ کر رازداری کے انداز میں کرسی سے ذرا کھسک کر کمل کی طرف جھک جاتا ہے۔ کمل ناگواری سے پیچھے سرک جاتی ہے)
۔۔۔ جب آپ باس کے پاس جائیں تو ذرا سی میری سفارش کر دیجیے گا۔

کمل : کیا کہہ رہے ہیں؟ ۔۔۔ کس بات کی سفارش کروں آپ کی؟

شرد : یہی کہ شرما جی کے کے بعد سب سے سنیئر میں ہوں۔ اس لیے ان کی پوسٹ مجھے ملنی چاہیئے۔

کمل : کیا باس کو یہ بات نہیں معلوم؟

شرد : معلوم ہو ہے۔ لیکن۔۔۔(رک کر ادھر اُدھر دیکھتا ہے۔ کمل پھر ٹائپنگ شروع کر دیتی ہے) پلیز آپ ٹائپنگ بند کر دیجیے۔ میرے کیریئر کا سوال ہے۔

کمل : (ٹائپنگ روک کر) آپ کی سینسیارٹی سے میرا کوئی تعلق نہیں اور نہ آپ کے کیریئر کے سوال کا جواب میرے پاس ہے۔

شرد : دھیرے بولیے۔ دھیرے۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔

کمل : (بے حد بے زاری سے) بھگوان کے لیے۔ جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالیے جلدی سے اور مجھے کام کرنے دیجیے۔

شرد : تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ویسے تو میں سب سے سینئر ہوں مگر کچھ سال پہلے کیش کے معاملے میں ذرا سی غلطی ہو گئی تھی۔۔۔ باس بے حد ناراض تھے۔ مجھے نوکری سے نکالنے کو تیار ہو گئے تھے لیکن آپ سے پہلے جو باس کی پی۔ اے۔ تھیں انھوں نے میری سفارش کی تو میری نوکری بچ گئی۔

کمل : اور اب آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی سفارش کروں تا کہ آپ کا پرموشن ہو جائے۔

شرد : (ہاتھ جوڑ کر) جی یہی۔۔۔ بس یہی!

کمل : لیکن آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ باس میری بات مان لیں گے۔

شرد : (بے حیائی سے ہنستا ہے) ہینھ۔۔۔ ہینھ۔۔۔ ہینھ۔۔ مانیں گے جی۔ سوفی صد مانیں گے۔

کمل : (غصے میں زور سے بولتی ہے) جی نہیں۔ باس میری بات نہیں مانیں گے۔ اور نہ یہ بات میں اُن سے کہوں گی۔

شرد : (کھڑا ہو جاتا ہے) دھیرے بولیے۔ دھیرے۔ اچھا خیر میں جا رہا ہوں۔

(چپراسی آتا ہے)

چپراسی : بائی تم کو ساب بُلاتا ہے۔

شرد : تو میں چلوں؟

کمل : آپ کی مرضی۔۔۔ چاہیں تو دن بھر یہیں کھڑے رہیے مجھے کیا! (شرد جاتا ہے۔ جاتے جاتے مُڑ کر چپراسی کی طرف دیکھ کر آنکھ مارتا ہے پھر مسکراتا ہوا چلا جاتا ہے۔ سریتا فائل سے سر اُٹھا کر شرد کی یہ حرکت دیکھ رہی ہے ۔۔۔ پھر فائل پڑھنا شروع کر دیتی ہے۔ کمل سریتا کی طرف دیکھ کر) کس قدر بے ہودہ آدمی ہے۔

(سریتا کوئی جواب نہیں دیتی)

چپراسی : بائی۔۔۔ساب بُلاتا ہے۔

کمل : سُن لیا۔۔۔سُن لیا۔۔۔بس یہ لیٹر ٹائپ کرلوں پھر۔۔۔!

چپراسی : نئ۔۔۔ساب باہر جاتا ہے۔تم کوابھیچ بلاتا ہے۔

کمل : اچھابابا۔۔۔تو چلو میں آرہی ہوں۔

(کمل کرسی پیچھے سرکا کر کھڑی ہوجاتی ہے۔میز پر سے پرس اُٹھا کر اس میں سے کنگھا نکال کر بالوں میں پھیرتی ہے۔آئینے میں دیکھتی ہے۔سریتا کھنکارتی ہے۔کمل آئینہ پرس میں رکھتے ہوئے سریا تا کی طرف دیکھ کر ذرا دیر چپ چاپ کھڑی رہتی ہے پھر پرس بند کر کے ہاتھ میں لے کر باس کے کمرے کی طرف بڑھتی ہے۔سریتا پھر کھنکارتی ہے۔کمل مُڑ کر اس کی طرف دیکھتی ہے۔لا پرواہی سے سر جھٹک کر چلی جاتی ہے)

(اسٹیج کے اس حصے میں اندھیرا ہوجاتا ہے)

دوسرا منظر

کمل : (دروازے پر کھڑے کھڑے پوچھتی ہے) ?May I come in sir

اجے : yes, come in ۔۔۔۔میں ایک منٹ میں یہ فائل دیکھ کر تم سے بات کرتا ہوں۔

چپراسی : جی ساب۔

اجے : بڑے بابو کو یہ فائل دے دو اور دیکھو اب کسی کو اندر مت آنے دینا۔ ہمیں کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔

چپراسی : جی ساب!

اجے : ہاں تو کمل بات یہ ہے کہ۔۔۔ ارے تو اب تک کھڑی ہو۔ بیٹھو بھئی بیٹھو۔ ہاں تو وہ لیٹر جو میں نے ٹائپ کرنے کو دیا تھا پورا ہو گیا؟

کمل : سوری سر! بس ذرا سا باقی ہے۔ ابھی کیے دیتی ہوں۔

اجے : Oh! Dont worry ۔۔۔اور بھئی یہاں میرے اور تمھارے سوا ہے کون؟ یہ سرور کا تکلف رہنے دو۔ میرا نام اجے ہے۔ مجھے اجے کہہ کر مخاطب کرو۔

کمل : آپ کیسی بات کر رہے ہیں!

اجے : ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں۔۔۔ اور یہ لیٹر ویٹر تو بہانہ تھا۔ میں نے دراصل یہ کہنے کو بُلایا تھا کہ آج شام کو سینما چلو گی؟

کمل : سر!۔۔۔ اجے!۔۔۔ اصل میں بات یہ ہے کہ آج ذرا۔۔۔ وہ مجھے کچھ کام ہے۔۔۔

اجے : اس طرح ٹالو مت کمل! آج کتنے دن سے میں تمھیں کہیں ساتھ لے جانے کو کہہ رہا ہوں۔ تم انکار کیے جا رہی ہو۔ میں خوشامد کر رہا ہوں۔۔۔ تم راضی ہی نہیں ہوتیں۔ مجھ سے نفرت کیوں ہے؟

کمل : نہیں یہ بات نہیں۔ اصل میں۔۔۔

اجے : ہاں ہاں کہو۔۔ رُک کیوں گئیں؟

کمل : اِس طرح پکچر وغیرہ جانا کچھ اچھا نہیں لگتا۔

اجے : اس میں کیا برائی ہے۔ دن بھر کے کام کے بعد ذرا سی دیر کو تھکے ہوئے دماغ کو آرام پہنچانے کے لیے ذرا سا منورنجن، ذرا سا تفریح کسی کو کیا نقصان پہنچا سکتی ہے؟

کمل : لیکن آپ اس کمپنی کے مالک ہیں۔ میں ایک معمولی سکریٹری۔۔۔ آپ کی نوکر۔۔۔

اجے : آفس کے وقت تک تو ہمارا مالک نوکر کا رشتہ ٹھیک ہے۔ مگر آفس بند ہونے کے بعد کیا تم مجھ سے ایک دوست کی

طرح نہیں مل سکتیں؟

کمل : دوست؟

اجے : ہاں کمل۔۔۔دوست! تم میری سکریٹری کے طور پر چھ مہینے سے کام کر رہی ہو۔ میں نے تمھیں اور تم نے مجھے اچھی طرح دیکھا ہے۔۔۔ پرکھا ہے۔اب اگر میں تمھاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤں تو کیا تم یہ ہاتھ جھٹک دو گی۔۔۔بولو۔۔۔کمل۔۔۔جواب دو!

کمل : میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کہوں!

اجے : کچھ مت کہو وہو۔۔۔بس آج شام میرے ساتھ پکچر چلو۔اچھا پکچر کو مارو گولی۔کہیں گھومنے چلیں گے۔۔۔کسی جگہ بیٹھ کر باتیں کریں گے۔

کمل : باتیں۔۔۔؟

اجے : ہاں۔۔۔باتیں۔بہت سی باتیں۔جو میں تم سے کرنا چاہتا ہوں۔۔۔سننا چاہتا ہوں۔

کمل : لیکن سر!

اجے : (اُسکی بات کاٹ کر) پھر وہی سر! کہو اجے۔۔۔۔اجے!

کمل : اچھا اجے ہی سہی۔۔۔لیکن آفس کے بعد اگر کہیں گئے تو گھر لوٹنے میں دیر ہو جائے گی

اجے : تو گھر فون کر دو کہ آج آفس میں اُوور ٹائم کے لیے رُک گئی ہوں۔

کمل : میرے گھر فون نہیں ہے۔

اجے : تو پھر آج ذرا جلدی گھر چلی جاؤ اور کہہ دو کہ آج آفس واپس جا کر بہت کام کرنا ہے۔را کو دیر ہو جائے گی۔۔۔واپسی کی فکر مت کرو۔میں تمھیں گھر چھوڑ دوں گا۔

کمل : اور آپ کے گھر والے؟ آپ کی مسز راہ دیکھیں گی۔

اجے : (اداسی سی ہنسی کے ساتھ) میری مسز؟ انھیں میری راہ دیکھنے کی فرصت کہاں ہے۔۔۔۔ان کے لیے روپیہ، پیسہ، زیور، کپڑے، بال، بچے، نوکر، چاکر، ملنے جلنے والے اور بہت سی اسی طرح کی دلچسپی کی چیزیں ہیں۔۔۔رہا میں! تو میں بس روپیہ بنانے کی مشین ہوں۔۔۔!

کمل : اوہ۔۔۔۔!

اجے : ہاں کمل۔۔۔۔میری پتنی نے آج تک مجھے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

کمل : اور آپ نے۔۔۔؟

اجے : میری دنیا اور ہے۔اس کی دنیا اور۔۔۔وہ کم پڑھی لکھی، پرانے خیالات کی عورت ہے۔ہماری شادی ہوئے بیس برس ہو چکے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ اب ہمارے بیچ کچھ نہیں رہ گیا ہے۔

کمل : لیکن سر!۔۔۔اجے۔اس طرح میرے ساتھ آپ باہر وقت گزاریں گے تو دوری اور بڑھے گی۔۔۔!

اجے : تم کتنی سمجھدار ہو کمل! کتنی اچھی، کتنی سوئٹ! تمھاری انھیں باتوں کی وجہ سے تو مین تمھاری طرف کھینچا چلا آرہا ہوں۔

کمل : لیکن یہ میری بات کا جواب تو نہیں ہوا۔

اجے : تمھاری بات کا جواب یہ ہے کمل کہ میری شادی شدہ زندگی کی تم کوئی فکر مت کرو۔۔۔اب میرا اپنی بیوی سے کوئی سمبندھ کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔

کمل : اور آپ کے بچے؟

اجے : بڑا لڑکا ٹیک نیکل ٹریننگ کے لیے امریکا گیا ہوا ہے۔اُس سے چھوٹی لڑکی پیرس کی ایک آرٹ اکیڈمی میں پینٹنگ سیکھ رہی ہے۔سب سے چھوٹا لڑکا یہیں ہے۔نام کے لیے کالج جاتا تو ہے لیکن اپنا زیادہ وقت آوارہ گردی میں صرف کرتا ہے۔پندرہ پندرہ دن ہم ایک دوسرے کی صورت تک نہیں دیکھتے۔یہ ہے ہماری زندگی!

کمل : لیکن پھر بھی میرا اس طرح آپ کے ساتھ گھومنا پھرنا کچھ اچھا نہیں لگے گا۔

اجے : اس میں بُرائی کیا ہے۔میری افسردہ، اداس زندگی میں تمھاری وجہ سے خوشی کے چند لمحے، سکھ کی کچھ گھڑیاں آجائیں گی۔۔۔کیا یہ بُرا ہے۔۔۔؟

کمل : آپ کے لیے تو بُرا نہیں مگر میرے لیے؟

اجے : تمھارے لیے بھی بُرا نہیں ہے کمل!۔۔۔اچھا! If You don't mint تم سے ایک پرسنل سوال پوچھوں؟

کمل : پوچھیے!

اجے : تمھاری عمر اٹھائیس برس کی ہوگئی ہے۔پچھلے برس سے نوکری کر رہی ہو۔کب تک اپنے خاندان کے لیے اپنی زندگی۔۔۔

کمل : (اس کی بات کاٹ کر) جی نہیں سر۔۔۔میرے خاندان کو میری کمائی کی ضرورت نہیں ہے۔نوکری تو میں اپنے شوق سے کر رہی ہوں!

اجے : اچھا! اپنے ہی شوق سے سہی۔کیا نوکری ہی تمھاری زندگی کا مقصد ہے۔۔۔؟

کمل : فی الحال تو اور کوئی پروگرام سامنے نہیں ہے۔

اجے : زندگی بہت مختصر ہے کمل۔۔۔! اور اس مختصر سی زندگی میں خوشی کی گھڑیاں اور بھی تھوڑی ہیں۔جو گھڑی بھی وقت

تمھاری جھول میں ڈال دے اُس سے فائدہ اُٹھالو ورنہ یہ گھڑیاں نہ جانے کہاں کھو جائیں گی اور تمھارے ہاتھ پچھتاوے کے سوا کچھ نہ لگے گا۔

کمل : سر! آج آپ نہ جانے کیسی باتیں کرنے لگے ہیں! میرا تو جی گھبرانے لگا۔۔۔دل بہت اُداس سا ہو گیا ہے آپ کی باتیں سُن کر!

اجے : اچھا ہے کہ تم بھی اُداس ہو جاؤ جتنا میں ہوں! پھر ہم دونوں مل کر اس اُداسی کو دور کرنے کی کوئی تدبیر سوچیں گے۔

کمل : میں تو اب تک اپنی اس اُداسی کو اچھی طرح سمجھ بھی نہیں سکی ہوں۔اسے دور کرنے کی کیا تدبیر سوچوں گی!

اجے : میں تمھاری مدد کروں گا کمل!۔۔۔بولو۔آج شام کو کچھ وقت میرے ساتھ گزاروگی؟ سکھ کی کچھ گھڑیاں میرے دکھی جیون کا خالی جھولی میں ڈالو گی؟ بولو کمل۔۔۔بولو!

کمل : (آہستہ سے) جی اچھا!

اجے : Good۔۔۔اوہ کمل! مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں بے حد خوش رہیں گے۔will make you happy!

کمل : (کرسی سے اُٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے) اچھا تو میں چلوں؟

اجے : ہاں ہاں۔مجھے بھی باہر جانا ہے۔شام کو پانچ بجے تیار رہنا!

(کمل باہر جاتی ہے۔اجے ٹکٹکی لگائے اسے دیکھتا رہتا ہے۔اسٹیج پر اندھیرا ہو جاتا ہے۔۔۔کچھ لمحے بعد اسپاٹ لائٹ آفس کے اسی کون پر جہاں کمل اور سریتا بیٹھتی ہیں۔)

تیسرا منظر

(سریتا فائل دیکھ رہی ہے۔ کمل آتی ہے۔ سریتا اس کے آنے کی آہٹ سنتے ہی پھر سے کھنکارنے لگتی ہے)

کمل : کیوں سریتا، کیا ہوا تمھیں۔۔۔؟ جب میں باس کے چیمبر میں گئی اس وقت بھی تم کھانس رہی تھیں۔۔۔ کیا جب سے اب تک کھانس رہی ہو؟

سریتا : ہاں، پورے پندرہ منٹ ہو گئے۔

کمل : اچھا! تو آج کل گھڑی دیکھ کر کھانسا کرتی ہو؟

سریتا : پھر اور کیا کروں؟ آج کل تم باس کے پاس جا کر وقت اور جگہ سب بھول جاتی ہو! کسی کو تو وقت کا حساب رکھنا چاہیے۔

کمل : Don't be silly! کام وام کچھ کرتی ہو نہیں اور بیٹھی اس طرح وقت ضائع کرتی ہو۔

سریتا : مجھے ٹالنے کی کوشش مت کرو کمل۔۔۔ میں بڑی سنجیدگی سے تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔

کمل : تو کرو نا۔۔۔ کس نے منع کیا ہے۔

سریتا : یہاں نہیں۔۔۔ لنچ ٹائم ہونے ہی والا ہے۔ چلو کسی ایسی جگہ چل کر بیٹھیں جہاں کوئی ہمیں ڈسٹرب نہ کرے۔ (فائل بند کر کے کھڑی ہو جاتی ہے) آؤ چلیں۔

کمل : ابھی سب لوگ لنچ کے لیے باہر چلے جائیں گے۔ باس خود باہر گئے ہیں۔ آدھے گھنٹے تک تو اس سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہاں کوئی ہمیں ڈسٹرب نہیں کرے گا۔

سریتا : (بیٹھ جاتی ہے) چلو یہی سہی۔۔۔ آج یہیں کچھ منگا لیتے ہیں (پکارتی ہے) بابو راؤ۔۔۔

چپراسی : جی بائی ساب!

سریتا : دو چائے اور پلیٹ سینڈوچ لے آؤ

چپراسی : جی بائی ساب۔

(چپراسی باہر جاتا ہے۔ کمل اور سریتا کی گفتگو کے دوران دو گلاسوں میں چائے اور لا کر رکھ دیتا ہے۔ دونوں باتیں بھی کر رہی ہیں اور کھانا پینا بھی جا رہے)

سریتا : بات یہ ہے کمل کہ تم میری بڑی پیاری سہیلی، بڑی اچھی ساتھی ہو۔ اس لیے کہہ رہی ہوں کہ آج کل تم جو کچھ کر رہی ہو یہ ٹھیک نہیں ہے۔

کمل : کیا مطلب ہے تمھارا؟

سریتا : مطلب تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو۔۔۔کئی دن سے دیکھ رہی ہوں کہ تم جب بھی باس کے چیمبر میں گئی ہو پندرہ بیس منٹ سے پہلے نہیں نکلتیں اور اس دوران میں بابوراؤ کسی کو اندر نہیں جانے دیتا۔

کمل : تم تو بات کا بتنگڑ بنا رہی ہو سریتا! باس اس کمپنی کے مالک ہیں۔ میں ان کی سکریٹری۔۔۔اگر مجھ سے کچھ کہنے کو وہ اپنے چیمبر میں بُلا لیں تو اس میں عجیب بات کیا ہوئی ؟

سریتا : اس آفس میں کام کرنے والے بچے نہیں ہیں۔کیا تم سمجھتی ہو کہ ہم سب بے وقوف ہیں؟

کمل : بے وقوف کیوں ہوتے۔ضرورت سے زیادہ عقل مند ہیں۔دوسرے کے پھٹے میں پاؤں ڈالنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں رکھتے۔

سریتا : نادانی کی باتیں مت کرو کمل! ہم سب نے دنیا دیکھی ہے۔حالات کا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔اچھا سچ سچ بتاو، آج اتنی دیر تک باس سے کیا باتیں ہوتی رہیں؟

کمل : انھوں نے آج شام مجھے اپنے ساتھ کہیں لے جانے کو کہا ہے۔

سریتا : ابھی تک تو باس تمھیں اپنے چمبر میں بلا کر باتیں کر لیتے تھے۔آج شام ساتھ گزارنے کو کہا ہے۔کچھ دن ریستوراں میں بیٹھ کر کافی پینے اور سمندر کے کنارے بیٹھ کر گپ شپ کرنے کے بعد آگے کی منزل آئے گی۔۔۔اور ایک دن تم ان کے ساتھ رات گزارنے کو راضی ہو جاؤ گی!

کمل : شٹ اَپ سریتا! میری اپنی پرانی ساتھی ہو کر میرے بارے میں ایسی باتیں کیسے سوچ سکتی ہو؟

سریتا : میں اس لیے سوچ رہی ہوں کہ تم نے اپنی سوچ کے دروازے بند کر دیے ہیں۔۔۔ذرا سوچو کمل، یہ راستہ تمھیں کہاں لیے جا رہا ہے۔تمھاری منزل کہاں ہے؟

کمل : میری کوئی منزل نہیں ہے۔راستہ جہاں لے جائے وہیں چلی جاؤں گی۔(بھنّا کر کھڑی ہو جاتی ہے) آخر میں بھی انسان ہوں۔۔۔میرے بھی دل ہے۔۔۔میں بھی زندگی سے کچھ چاہتی ہوں۔

سریتا : کیا چاہتی ہو؟ اجے کماری کی رکھیل بننا؟

کمل : (بے انتہا غصے کے ساتھ) سریتا۔۔۔!(کرسی پر بیٹھ کر سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیتی ہے)

سریتا : کیوں! بگڑ کیوں گئیں؟ کیا اجے کمار تم سے شادی کر رہا ہے؟ (کمل انکار میں سر ہلا رہی ہے۔کچھ بولتی نہیں) ظاہر ہے۔شادی تو اپنے برابر والے کسی امیر سیٹھ کی لڑکی سے ہی کی جاتی ہے۔۔۔سکریٹری کے ساتھ تو صرف وقت گزارا جاتا ہے۔

کمل : نہیں سریتا۔یہ بات نہیں ہے۔

سریتا : پھراورکیابات ہے۔

کمل : وہ بہت دُکھی ہیں۔میرے ساتھ سکھ کی کچھ گھڑیاں گزارنا چاہتے ہیں۔

سریتا : کیوں؟ بیوی کے ساتھ سکھ کی کچھ گھڑیاں نہیں گزاری جاسکتیں کیا؟

کمل : اُن کی بیوی نے کبھی انھیں سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی

سریتا : ہونہہ! بیس پچیس برس کی شادی شدہ زندگی کے بعداب کہتے ہیں کہ بیوی سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔دُکھی ہیں۔۔۔ اورتم اتنی بےوقوف ہو کہ اُن کی باتوں میں آگئیں!

کمل : اورکیا کرتی؟

سریتا : توگویاتم جان بوجھ کرخودکودھوکا دے رہی ہو۔

کمل : شایدتم ٹھیک کہہ رہی ہو۔

سریتا : تمھیں اس سے ملے گا کیا؟

کمل : مجھے آج تک زندگی سے کیاملاہے جواب ملنے کی فکرکروں!

سریتا : یہ توغلط کہہ رہی ہوتم! زندگی نے تمھیں بہت کچھ دیا ہے۔پڑھی لکھی ہو،تندرست ہو،قبول صورت ہو۔اچھی نوکری ہے،تنخواہ بھی کافی ہے!

کمل : بس۔۔۔کیاایک لڑکی کی زندگی میں یہی کافی ہے؟اس کے علاوہ اسے اورکچھ نہیں چاہیے؟

سریتا : چاہیےتوبہت کچھ۔۔۔لیکن جتنازیادہ چاہو،نہ ملنے کادکھ اتناہی بڑاہوتا ہے۔

کمل : مگرمیں توزندگی سے کبھی بڑی ڈیمانڈنہیں کی!بہت معمولی چیزوں،بہت چھوٹے چھوٹےسکھوں کی تمنا کی تھی۔ ایک چھوٹاساگھر،ایک ہم خیال،ہم مزاج شوہر،ہنستے کھیلتے ایک دو بچے اور۔۔۔

سریتا : (اس کی بات کاٹ کر) توکیازندگی میں آج تک تمھیں کوئی ہم خیال،ہم مزاج شخص نہیں ملا؟

کمل : (ٹھنڈی سانس بھرکے) ملاتھاایک۔۔۔!

سریتا : کون؟ کب؟ کہاں۔۔۔؟ کیانام تھااس کا؟

کمل : اب اس ظالم کانام سن کرکیا کروگی۔۔۔بس یوں سمجھ لوبلکل ویساہی تھاجیسامیں خوابوں میں دیکھا کرتی تھی!

سریتا : کب کی بات ہے یہ؟

کمل : دس گیارہ برس پہلےک۔۔۔میں کالج میں پڑھتی تھی۔وہ مجھ سے ایک سال آگے تھے۔کالج کی سوشل گیدرنگ کے وقت ہم نے ایک ساتھ ڈرامے میں کام کیا تھا۔پھرہم دھیرے دھیرےقریب آتے گئے۔

سریتا : پھر۔۔۔؟

کمل : پھر ہم نے مل کر بڑے بڑے پلان بنائے۔ بڑے سُندر سُندر سپنے دیکھے۔

سریتا : یہی کہ ایک چھوٹا سا گھر ہو

کمل : یہ تو تھا ہی۔۔۔لیکن اس کے ساتھ اور بھی بہت کچھ۔

سریتا : بہت کچھ کیا۔۔۔؟

کمل : یہی کہ ہم دونوں مل کر وطن کی خدمت کریں گے۔ اپنے پیارے دیش سے غریبی، بیکاری، جہالت دور کریں گے! وہ ایک بہت بڑے فیکٹری اونر کا بیٹا تھا۔۔۔اُس نے سوچا تھا کہ کسی گاؤں میں جا کر ایک کارخانہ کھولے گا تا کہ آس پاس کے کئی گاؤں کے بیکار لوگوں کو کام مل جائے۔ میں نے سوچا تھا کہ میں گاؤں کی عورتوں اور بچوں کے لیے اسکول کھولوں گی۔۔۔ہم دونوں مل کر ایک گاؤں کو نمونے کا گاؤں بنا دیں گے۔

سریتا : پھر کیا ہوا اُس پلان کا؟

کمل : وہی جو ہونا تھا۔ سپنا ٹوٹ گیا۔ آنکھ کھل گئی!

سریتا : کیسے ٹوٹا سپنا؟

کمل : ایک دن اُسے پتہ چل گیا کہ میں ایک بہت ہی معمولی گھرانے کی لڑکی ہوں۔ پتا جی ایک جگہ لفٹ مین ہیں، ماں لوگوں کے برتن مانجھتی ہے۔۔۔اور یہ بھی کہ ہم لوگ ایک جھوپڑ پٹی میں رہتے ہیں۔

سریتا : مگر تم نے یہ سب اُس سے چھپایا کیوں تھا؟

کمل : چھپانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس نے مجھ سے میرے گھرانے کے بارے میں کچھ پوچھا ہی نہیں۔ نہ جانے کیسے خود ہی سمجھ بیٹھا کہ میں اُس کی طرح ایک امیر گھرانے کی لڑکی ہوں۔

سریتا : پھر اسے یہ سب کیسے معلوم ہوا؟

کمل : (لمبی سانس کھینچ کر) تم میرے چھوٹے بھیّا سے ملی ہو؟

سریتا : وہی جو اکثر تمھیں کار میں موٹر بائیک پر آفس تک چھوڑنے آتے ہیں؟

کمل : ہاں۔۔۔! وہی میرے بھیّا! تین سال کی جیل کاٹ چکے ہیں۔

سریتا : ہیں!۔۔۔جیل۔۔۔؟

کمل : چونک گئیں نا! اسے جب پتہ چلا کہ میرے بھیّا کو جیل ہوگئی ہے تو پہلے بہت ہمدردی کرتا رہا۔ میرے آنسو پونچھے۔ ظالم سماج سے لڑنے کا ارادہ اور پکا کر لیا۔ لیکن جب اسے پتہ چلا کہ یہ جیل دیش پریم کے لیے نہیں بلکہ

اسمگلنگ کے گروپ کے ساتھ پکڑے جانے پر ہوئی ہے تو وہ کھنچا کھنچا سا رہنے لگا۔

سریتا : مگر اس میں تمھارا کیا قصور تھا؟

کمل : میں نے بھی اس سے یہی کہا تھا۔ قسمیں کھائیں کہ مجھے پتہ نہیں تھا کہ بھیّا یہ کام کرتے ہیں۔ بظاہر تو وہ ایک موٹر میکنک تھے۔ اب بھی وہی کام کرتے ہیں۔۔۔ جن کاروں میں مجھے چھوڑنے آتے ہیں وہ سب دوسروں کی ہوتی ہیں، گیریج میں مرمت کے لیے آتی ہیں تو بھیّا درست کرنے کے بعد ایک آدھ بار استعمال کر کے واپس کر دیتے ہیں۔

سریتا : پھر تمھارے اس آدرش وادی دیش سیوک نے یہ سُن کر کیا کیا؟

کمل : وہ کیا کرتا؟ خود میں نے اسے بتا دیا کہ میرے پتا جی لفٹ مین ہیں۔ ماں لوگوں کے برتن مانجھتی ہیں اور بڑے بھیّا ٹیکسی ڈرائیور ہیں۔ ایک دن اسے اپنے گھر بھی لے گئی۔

سریتا : پھر۔۔۔؟

کمل : پھر کیا! پہلے ہم جہاں رہتے تھے وہ جگہ تم نے بھی نہیں دیکھی۔۔۔ چاروں طرف بہتی گندی نالیوں اور چوڑے کے بیچ بنی ہماری جھونپڑی میں بیٹھا وہ بے چینی سے پہلو بدلتا رہا۔۔۔ ماں کے سوالوں کے ایک دو لفظوں میں جواب دیتا رہا۔ آدھا، ایک گھنٹہ بیٹھ کر، چائے کا ایک کپ زہر کے گھونٹ کی طرح حلق سے اُتار کر وہ چلا گیا۔۔۔

سریتا : اور اس کے آدرش۔۔۔؟

کمل : آدرش اپنی جگہ قائم ہیں۔ اب بھی وہ ویسا ہی آدرش وادی ہے۔ بڑے بڑے بھاشن دیتا ہے۔ سُنا ہے اگلے الیکشن میں اسمبلی کے لیے کھڑا ہونے والا ہے۔

سریتا : مگر تم سے کیا کہہ کر ترکِ تعلق کیا؟

کمل : مجھ سے تو کچھ نہیں کہا۔۔۔ ایک بار بڑے بھیّا اس سے ملنے گئے اور میری شادی کی بات کی تو کہنے لگا کہ میرے پتا جی سے بات کیجیے۔ اُس کے پتا جی نے اُلٹا میرے بھیّا سے سوال کیا کہ شادی کے بعد جب لوگ میرے بیٹے سے پوچھیں گے کہ تمھاری بیوی کس گھرانے کی ہے تو وہ کیا جواب دے گا؟ کیسے کہہ سکے گا کہ سسُر لفٹ مین ہیں، ساس برتن مانجھنے والی! ہمارے اور آپ کے سماجی حالات میں جو فرق ہے وہ اس خلیج کی طرح ہے جسے پاٹنا مشکل ہے۔

سریتا : مگر تم دونوں نے مل کر جو پلان بنائے تھے۔ جو سپنے دیکھے تھے؟

کمل : وہ سب جھوپڑ پٹی کی گندی نالیوں میں بہہ گئے۔

سریتا : اس کے بعد۔۔۔؟

کمل : اس کے بعد میں شاک اور دکھ سے بیمار پڑ گئی۔ امتحان میں فیل ہوگئی۔۔۔میں نے سوچا اب جینا بےکار ہے یا اگر موت کے انتظار میں جینا ہے تو پھر پڑھنے لکھنے کی ضرورت کیا؟ کس کام آئے گی پڑھائی لکھائی؟ رہوں گی تو میں لفٹ مین اور برتن مانجھنے والے ہی کی بیٹی۔۔۔!

سریتا : پھر تم نے بی اے کب کیا؟

کمل : پتا جی کو میرے اور چھوٹے بھیّا کے دکھ نے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا۔۔۔وہ اتنے کمزور ہو گئے کہ انھیں نوکری سے نکال دیا گیا۔ اِدھر ماں محنت کرتے کرتے بیمار پڑ گئیں۔ اب صرف بھیّا کی ٹیکسی تھی جس پر سارے گھر کا گزارا تھا۔ پھر چھوٹے بھیّا جیل سے چھوٹ کر آ گئے۔۔۔اُنھوں نے آ کر میری ہمت بندھائی۔ جینے اور حالات سے لڑنے کا حوصلہ پھر سے مجھ میں پیدا کیا۔ میں نے امتحان دیا۔ پاس ہوگئی۔ ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سیکھا۔ نوکری کی اور آج تمھارے سامنے بیٹھی ہوں۔ یہ ہے میری رام کہانی۔۔۔!

سریتا : مگر تمھارے گھر والوں نے کہیں اور تمھاری شادی کرنے کی کوشش نہیں کی۔۔۔؟

کمل : یہ سب میں تمھیں کل بتاؤں گی۔ لنچ ٹائم ختم ہونے کو ہے۔ باقی لوگوں کے آنے سے پہلے میں چلوں۔۔۔

سریتا : کہاں چلیں؟

کمل : بتایا تو تھا کہ آج شام مجھے باس کے ساتھ گزارنی ہے۔ اس سے پہلے گھر جا کر ماں کو بتا دوں کہ آج آفس میں اوورٹائم کروں گی۔۔۔! (سریتا غصے سے کمل کو گھور کر دیکھتی ہے) اس طرح گھور گھور کر مت دیکھو۔ باس کی اجازت سے جلدی جا رہی ہوں۔۔۔اچھا بائی!

چوتھا منظر

(کمل کا گھر۔کمل آفس جانے کی تیاری کررہی ہے۔ماں چائے کی پیالی لے کرآتی ہے)

کمل : ارے ماں جی!تم کیوں اُٹھ گئیں بستر سے؟ڈاکٹر نے تمھیں آرام کرنے کے لیے کہا ہے۔

ماں : آرام کے سوا میں اور کرہی کیا رہی ہوں،آج کل!۔۔۔۔رات تو کب آئی مجھے پتہ بھی نہ چلا!

کمل : پتا جی نے دروازہ کھولا تھا۔تم سوگئیں تھیں اس لیے تمھیں اُٹھانا اچھا نہیں لگا۔

ماں : تو اوورٹائم نہ کیا کر بیٹی۔۔۔تیرا اتنی رات تک باہر رہنا مجھے بلکل اچھا نہیں لگتا۔

کمل : مجھے کب اچھا لگتا ہے۔۔۔مگر مجبوری ہے۔نوکری کرنی ہے تو باس کا حکم ماننا ہی پڑے گا۔وہ کام ختم کرنے کے لیے رکنے کو کہیں تو انکار تھوڑے ہی کیا جاتا ہے

ماں : اچھا۔آج آفس نہ جا۔چھٹی لے لے۔

کمل : کیوں ماں۔۔۔؟

ماں : اری باولی۔تجھے دیکھنے آرہے ہیں۔

کمل : ماں!میں نے تم سے کتنی بار کہہ دیا ہے کہ پتا جی کو منع کردو میری شادی کی فکر نہ کریں۔میں کسی پر بوجھ نہیں ہوں۔ اپنے پیروں پر کھڑی ہوں۔

ماں : اپنے پیروں پر کھڑا ہونا کافی نہیں ہوتا بیٹی!پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہے۔جینے کے لیے عورت اور مرد دونوں کو ایک دوسے کا ساتھ چاہیے۔۔۔یہ تو بھگوان کا بنایا ہوا قانون ہے۔منشیہ کا سوبھاؤ ہے۔تو کیسے اکیلی یہ پہاڑ سا جیون بتائے گی؟

کمل : نہیں بتا سکی تو مر جاؤں گی۔۔۔بس!

ماں : ضد نہ کر بیٹی۔۔۔تیرے بڑے بھائی نے بھی لڑکے کی تعریف کی ہے۔

کمل : کون ہے؟۔۔۔کیا نام ہے؟۔۔۔کیا کرتا ہے؟۔۔۔کہاں رہتا ہے؟مجھے کچھ پتہ نہیں۔۔۔وہ آئے گا۔مجھے دیکھے گا۔۔۔گائے،بکری کی طرح ٹٹولے گا۔پسند کرے گا تو آپ سب اس کے ساتھ میرا پلّو باندھ کر بدا کر دیں گے اور اسے میں پسند نہ آئی تو آپ لوگ پھر دوسرے کی تلاش میں جُٹ جائیں گے۔کیا اس سارے تماشے میں مجھے کچھ کہنے،سننے پسند ناپسند کا حق نہیں۔۔۔؟

ماں : اتنی ناراض کیوں ہوتی ہے۔تیری پسند سے ہی ہوگا۔۔۔لڑکا اچھے گھر کا ہے۔میٹرک پاس ہے۔

کمل : میں بی اے پاس ہوں!

ماں : ٹیکسی چلاتا ہے۔

کمل : میں ایک بہت بڑی کمپنی کے مالک کی سیکریٹری ہوں!

ماں : اچھا خاصا کما لیتا ہے۔

کمل : میں بھی اچھی خاصی تنخواہ پاتی ہوں!

ماں : تو کہنا کیا چاہتی ہے؟

کمل : میں ٹیکسی ڈرائیور سے شادی نہیں کروں گی!

ماں : ٹیکسی ڈرائیور سے تو شادی نہیں کرے گی۔۔۔! اور وہ جو تیرا راجکمار آیا تھا وہ تجھ سے شادی نہیں کرے گا۔۔۔ پھر تیرا کیا ہوگا؟

کمل : جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔۔۔ فلحال تو تم نے مجھے آفس جانے میں دیر کرا دی۔

(باہر سے آواز آتی ہے۔۔۔ ''ماں جی۔۔۔!'')

ماں : کون۔۔۔؟ (باہر جھانکتی ہے) پرکاش۔۔۔! آؤ بیٹا۔۔۔ کیا بات ہے؟

پرکاش : نمستے ماں جی!۔۔۔ نمستے کمل جی!۔۔۔ چھوٹے بھیّا نے یہ سبزی بھیجی ہے۔ (سبزی کی باسکٹ ماں کو پکڑا دیتا ہے)

ماں : لا بیٹا!۔۔۔ جیتا رہے۔

(ماں سبزی لے کر اندر چلی جاتی ہے۔ کمل میز پر سے اپنا پرس اور کاغذات اٹھا رہی ہے۔ پرکاش چپ چاپ کھڑا اُسے دیکھے جا رہا ہے)

کمل : (پرکاش سے) چھوٹے بھیّا ہیں گیراج میں؟

پرکاش : جی نہیں۔ وہ تو باہر گئے ہیں۔۔۔ کیا کام تھا آپ کو؟ مجھ سے کہیے میں کر دوں۔۔۔؟

کمل : جی نہیں۔۔۔ آپ کا حرج ہوگا۔

پرکاش : نہیں نہیں۔۔۔ آپ کہیے تو۔۔۔ آپ کی سیوا کرنے میں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ آپ کہیے تو سہی۔۔۔!

کمل : بات یہ ہے کہ پرکاش جی آج مجھے آفس جانے میں ذرا دیر ہو گئی ہے۔ چھوٹے بھیّا ہوتے تو ان سے کہتی کہ ریپیئر س کے لیے آئی ہوئی کسی کار میں ذرا مجھے آفس تک چھوڑ آتے۔

پرکاش : تو آئیے نا۔۔۔ میں چھوڑ آؤں۔ بشرطیکہ آپ کو میرے ان پٹرول، ڈیزل، گریز، کالک وغیرہ وغیرہ سے سنے ہوئے کپڑوں سے گھن نہ آ رہی ہو اور میرے ساتھ بیٹھتے ہوئے شرم نہ آئے۔

کمل : شرم کی کیا بات ہے۔میرے چھوٹے بھیّا بھی تو اسی حلیے میں رہتے ہیں۔

پرکاش : مگر آپ کے ساتھ جب بھی جاتے ہیں پہلے نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہن لیتے ہیں۔لیکن میرا گھر یہاں سے دور ہے اس لیے آپ کو میرے اس حلیے کو برداشت کرنا ہی ہوگا۔۔۔خیر آفس میں کوئی پوچھے تو کہہ دیجیے گا کہ میرا ڈرائیور تھا!

پرکاش : جی نہیں جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔میرے آفس میں سب کو معلوم ہے کہ میرے پاس کار نہیں ہے،اور میں نے سب کو بتا دیا ہے کہ میرا بھائی ایک معمولی موٹر میکینک ہے۔

پرکاش : ایسے کڑوے سچ آپ کس طرح بول لیتی ہیں؟

کمل : ایک بار چپ رہنے کی سزا پا چکی ہوں اس لیے اب بولنا سیکھ گئی ہوں!

پرکاش : میرے لیے بھی چپ رہنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔آج میں بھی ایک سچ بول دوں۔۔۔؟

کمل : آپ کی مرضی۔۔۔۔!

پرکاش : جی نہیں۔۔۔آپ کی مرضی ضروری ہے۔

کمل : آپ کے سچ سے میرا کیا تعلق ہے۔۔۔؟

پرکاش : بہت زیادہ تعلق ہے کمل جی۔۔۔! کہیے بول دوں؟

کمل : عجیب آدمی ہیں آپ۔۔۔!

پرکاش : عجیب تو نہیں۔۔۔بہت معمولی،سیدھا سادا ویکتی ہوں۔اسی لیے سچ بولتے ہوئے ڈرتا ہوں۔

کمل : دیکھیے مجھے دیر ہو رہی ہے۔

پرکاش : جی بس ابھی کار لایا اور منٹوں میں آپ کو آفس پہنچا دیا۔۔۔یہ بتایئے کہ آپ صرف سچ بولتی ہیں یا سچ سننے کی ہمت بھی ہے آپ میں؟

کمل : آپ بول کر دیکھ لیجیے۔

پرکاش : اچھا۔۔۔۔تو بات یہ ہے کمل جی۔۔۔۔

کمل : کہیے نا

پرکاش : میں بہت دن سے آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔

کمل : تو کیجیے نا۔۔۔!

پرکاش : بات یہ ہے کمل جی۔۔۔کہ وہ۔۔۔میں۔۔۔آپ۔۔۔آپ مجھ سے شادی کریں گی۔۔۔؟

کمل : (بے حد تعجب سے)۔۔۔۔جی؟

پرکاش : جی۔۔۔شادی۔۔۔!

کمل : آپ سے؟

پرکاش : جی ہاں۔۔۔مجھ سے۔۔۔! چاہے آپ کے لیے یہ عجیب بات ہو، آپ چاہے مجھ پاگل سمجھیں، مگر میرا جیون کی سب سے بڑی آشا، سب سے مدھر کامنا اور سب سے میٹھا سپنا ہے۔۔۔!

کمل : بس۔۔۔بس پرکاش جی۔لگتا ہے آج آپ پی کر آگئے ہیں۔اس لیے اپنے آپے میں نہیں ہیں؟

پرکاش : آج تو خیر میں پی کر نہیں آیا۔ویسے یہ سچ ہے کہ میں اپنے آپ میں نہیں ہوں ورنہ یہ نہ بھولا کہ کہاں آپ۔۔۔ کہاں میں۔۔۔! آپ بی اے پاس، میں آٹھویں فیل۔۔۔! آپ ایک بہت بڑی کمپنی کے مالک کی سیکریٹری ۔۔۔میں ایک معمولی گیراج میں میکنک۔۔۔آپ شریف، نیک، سمجھدار۔۔۔میں شرابی۔۔۔موالی! جس سے میں نے آپ کے چھوٹے بھیّا کے ساتھ کام شروع کیا ہے، روز آپ کو آتے جاتے دیکھتا رہتا ہوں۔آپ ہی کو دیکھتا ہوں۔

کمل : لیکن۔۔۔یہ شادی کا خیال۔۔۔آپ کو کیسے آیا؟

پرکاش : ادھر کئی بار میں آپ کے پتا جی اور چھوٹے بھیّا کو باتیں کرتے سنا کہ وہ آپ کی شادی کے لیے پریشاں ہیں تو میرے من میں خیال آیا کہ اگر میں خود کو آپ کے لائق بنانے کی کوشش کروں تو شاید آپ۔۔۔میری بات کا وشواس کیجیے کمل جی۔۔۔چھوٹے بھیّا سے پوچھ لیجیے۔مدّت ہوگئی میں نے شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔بس اپنے کام سے کام ہے۔زیادہ سے زیادہ روپیہ کمانے کی فکر ہے۔نائٹ اسکول بھی جانا شروع کر دیا ہے۔آپ چھوٹے بھیّا سے پوچھ لیجیے۔

کمل : (بے حد روہانسی ہوکر) پرکاش جی۔۔۔! میں آپ کے اس جذبے کی قدر کرتی ہوں۔بھگوان آپ کی سہایتا کرے۔۔۔آپ خوب پڑھیں، لکھیں۔خوب پیسہ کمائیں۔لیکن میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں، میرا خیال چھوڑ دیجیے۔ہمارے راستے الگ الگ ہیں۔اچھا میں چلتی ہوں۔

پرکاش : ٹھہریئے۔۔۔! میں ابھی کار لاتا ہوں۔

کمل : جی نہیں۔۔۔آج دیر ہی سہی۔میں بس سے ہی جاؤں گی۔

(پرس اور کاغذات اُٹھا کر باہر چلی جاتی ہے۔پرکاش کھڑا اُسے دیکھ رہا ہے۔۔۔اس حصّے میں اندھیرا ہو جاتا ہے۔)

پانچواں منظر

(آفس کا وہی کونا جو پہلے اور تیسرے منظر میں تھا۔ سریتا بیٹھی ایک فائل پر کچھ لکھ رہی ہے۔ کمل داخل ہوتی ہے۔ سریتا اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتی ہے۔ پھر کمل کی طرف دیکھ کر اس سے مخاطب ہوتی ہے)

سریتا : گڈ مارننگ!

(پھر گھڑی دیکھتی ہے۔ کمل جواب دیے بغیر ٹائپ رائٹر کا کور اتارتی ہے۔ سریتا پھر لکھنا شروع کر دیتی ہے۔ پھر لکھتے لکھتے کمل کی طرف دیکھے بغیر بولتی ہے)

سریتا : آج باس بھی ابھی تک آفس نہیں آئے؟

کمل : تو۔۔۔؟ مجھے کیوں سُنا رہی ہو؟

سریتا : آفس میں لوگ نہ اندھے بہرے ہیں اور نہ ایڈیٹ!

کمل : یعنی۔۔۔؟

سریتا : دو اور دو چار کا حساب ہی لگا سکتے ہیں۔

کمل : بھگوان کے لیے سریتا مجھے پریشان مت کرو۔ (دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ جاتی ہے۔ پھر سسکیاں بھرنے لگتی ہے)

سریتا : Don't be silly! کمل۔۔۔ اپنے آپ کو سنبھالو ورنہ سب لوگ اِدھر ہی دیکھنے لگیں گے۔ (کمل پرس کھول کر رومال نکالتی ہے۔ آنسو پونچھتی ہے۔ پھر اپنا میک اپ درست کر کے پرس بند کر دیتی ہے۔ دونوں ہاتھ گود میں رکھے چپ چاپ بیٹھی خلا میں گھور رہی ہے۔ سریتا کمل کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بڑی نرمی اور محبت سے) مجھے نہیں بتاؤ گی۔۔۔؟ ارے ارے پھر آنسو بہنے لگے۔۔۔! اچھا بھئی جانے دو۔ میں نہیں پوچھتی۔ مگر بھگوان کے لیے آنسو پونچھ لو۔

کمل : (کمل آنسو پونچھتی ہے) تم نہیں پوچھوگی تو میں اپنے دل کی بات کس سے کہوں گی۔ گھر میں ماں، تا جی اور بڑے بھیّا تو میرے دل کی حالت سمجھنے کے لائق ہی نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک تو لڑکی کی شادی میں جیون ساتھی کا ہم خیال، ہم مزاج اور من پسند ہونا ضروری نہیں۔ بس نام کے ساتھ شادی کا ٹھپّہ لگ جانا کافی ہے۔ رہے چھوٹے بھیّا جو میرے دل کی حالت اچھی طرح سمجھتے ہیں وہ بے حد مجبور ہیں۔ میں بھی مجبور ہوں۔۔۔۔!

سریتا : یہ زخم تو پرانا ہے۔۔۔ کیا آج اس میں کوئی نئی ٹھیس لگ گئی؟

کمل : ایک نہیں۔۔۔۔دو، دو!

سریتا : بتا سکتی ہو۔۔۔؟

کمل : ہاں۔۔۔آج پتا جی کے کوئی دوست اپنے لڑکے کے ساتھ مجھے دیکھنے آنے والے تھے۔

سریتا : پھر۔۔۔؟

کمل : میں نے انکار کر دیا۔

سریتا : کیوں۔۔۔؟

کمل : لڑکا میٹرک پاس ہے۔ٹیکسی ڈرائیور ہے!

سریتا : اوہ۔۔۔!(کمل گہرا سانس لے کر خاموش ہو جاتی ہے)اتنی اُداس مت ہو، دوسرا پرپوزل آجائے گا۔۔۔!

کمل : دوسرا بھی آ گیا!

سریتا : ہیں۔۔۔! آج ہی۔۔۔؟

کمل : ہاں۔۔۔آج ہی!

سریتا : اس کا کیا ہوا۔۔۔؟

کمل : میں نے انکار کر دیا۔

سریتا : پھر انکار۔۔۔؟

کمل : ہاں۔۔۔!

سریتا : کیوں۔۔۔؟

کمل : وہ چھوٹے بھیّا کے ساتھ گیراج میں کام کرتا ہے۔آٹھویں فیل ہے۔پہلے شراب پیتا تھا۔

سریتا : اور اب۔۔۔؟

کمل : میرے لائق بننے کے لیے شراب چھوڑ دی۔نائٹ اسکول میں داخلہ لیا ہے۔بے حد محنت کر رہا ہے تا کہ خوب پیسہ کمائے۔۔۔

سریتا : Poor thing مجھے بے چارے پر ترس آ رہا ہے۔

کمل : اور مجھ اس کی اور اپنی حالت پر رونا آ رہا ہے۔سریتا! تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟۔۔۔سماج کے جس طبقے سے میرا تعلق ہے اُس طبقے کی لڑکیاں پڑھ لکھ جائیں تو اپنے طبقے کے ان پڑھ یا کم پڑھے لکھے، معمولی حالت میں رہنے والے نوجوانوں سے شادی کرنا پسند نہیں کرتیں اور جو نوجوان ہماری نظر میں جچتے ہیں اُن کا تعلق پڑھے

لکھے خاندانوں اور خوش حال گھرانوں سے ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔وہ لوگ ہم سے فلرٹ تو کر سکتے ہیں شادی نہیں کرتے۔اسی چکر میں ہماری عمریں نکلی جارہی ہیں۔سریتا! تم بھی تو میرے ہی طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔تمھیں کیسے من پسند پتی مل گیا؟

سریتا : (طنز سے ہنس کر) من پسند۔۔۔؟ میں نے حالات کے آگے سر جھکا دیا۔لڑنے کے بجائے گھاٹے پر صلح کر لی!

کمل : مگر گھاٹے پر صلح کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

سریتا : تو یہ ادھیڑ عمر کا۔۔۔بیس برس کی بیاہتا بیوی کا شوہر۔۔۔۔تین جوان بچوں کا باپ۔۔۔اجے کمار!۔۔۔یہ کیا ہے؟ کیا یہی ہے تمھاری منزل۔۔۔؟

کمل : مجھے خود نہیں معلوم میری منزل کہاں ہے؟

اندھیرا

☆☆☆

حسرت موہانی

غزل

اک خلش ہوتی ہے محسوس رگِ جاں کے قریب
آن پہنچے ہیں مگر منزلِ جاناں کے قریب

حشر میں اپنے گناہوں سے مجھے خوف ہو کیا
اُن کی رحمت بھی تو ہے منزلِ عصیاں کے قریب

لپٹے اس ڈھب سے کہ پھر نہ ہو جدا خاک مری
کہیں پہنچے بھی تو اس گوشۂ داماں کے قریب

لکھنؤ آنے کا باعث یہ کھلا آخر کار۔
کھینچ لایا ہے دل اک شاہد پنہاں کے قریب

روز ہوجاتی ہے رویا میں زیارت حسرت
آستانِ شہِ رزاق ہے زنداں کے قریب

☆☆☆

جگرمرادآبادی

غزل

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی، عرفانِ محبت عام نہیں

یہ تُونے کہا کیا اے ناداں، فیاضیِ قدرت عام نہیں
تُو فکر ونظر تو پیدا کر، کیا چیز ہے جو انعام نہیں

یارب یہ مقامِ عشق ہے کیا؟ گو دیدۂ ودل ناکام نہیں
تسکین ہے اور تسکین نہیں، آرام ہے آرام نہیں

کیوں مستِ شرابِ عیش وطرب تکلیف توجہ فرمائیں
آوازِ شکستِ دل ہی تو ہے، آوازِ شکستِ جام نہیں

آنا ہے جو بزمِ جاناں میں، پندارِ خودی کو توڑ کے آ
اے ہوش وخرد کے دیوانے، یاں ہوش وخرد کا کام نہیں

زاہد نے کچھ اس انداز سے پی، ساقی کی نگاہیں پڑنے لگیں
مَےکش یہی اب تک سمجھے تھے، شائستہ دورِ جام نہیں

عشق، اور گوارا خود کرلے بے شرط شکستِ فاش اپنی
دل کی بھی کچھ اُن کے سازش ہے، تنہا یہ نظر کا کام نہیں

سب جس کو اسیری کہتے ہیں، وہ تو ہے اسیری ہی لیکن
وہ کون سی آزادی ہے یہاں، جو آپ خود اپنا دام نہیں

☆☆☆

فراق گورکھپوری

غزل

سر میں سودا بھی نہیں ، دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بے گانوں میں
لیکن اس جلوہ گہِ ناز سے اٹھتا بھی نہیں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے، ایسا بھی نہیں

آج غفلت بھی ان آنکھوں میں ہے پہلے سے سوا
آج ہ خاطرِ بیمار شکیبا بھی نہیں

آہ یہ مجمع احباب - یہ بزم خاموش
آج محفل میں فراقؔ سخن آرا بھی نہیں

☆☆☆

مجروح سلطانپوری

غزل

جَلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ، ہمارے ساتھ چلے

دیارِ شام نہیں ، منزلِ سحر بھی نہیں
عجب نگر ہے، یہاں دن چلے نہ رات چلے

ہمارے لب نہ سہی، وہ دہانِ زخم سہی
وہیں پہنچتی ہے یارو، کہیں سے بات چلے

ستونِ دار پر رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

ہوا اسیر کوئی ہم نوا تو دُور تلک
بہ پاسِ طرزِ نوا ہم بھی ساتھ چلے

بچا کے لائے ہم اے یار، پھر بھی نقدِ وفا
اگرچہ لٹتے رہے رہزنوں کے ہاتھ چلے

پھر آئی فصل کہ مانندِ برگِ آوارہ
ہمارے نام گلوں کے مرا سلات چلے

قطارِ شیشہ ہے یا کارانِ ہم سفراں
خرامِ جام ہے یا جیسے کائنات چلے

بھلا ہی بیٹھے جب اہلِ حرم تو اے مجروحؔ
بغل میں ہم بھی اک صنم کا ہاتھ چلے

☆☆☆

ناصر کاظمی

غزل

کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے
گزر گئی جرسِ گل اُداس کر کے مجھے

میں سو رہا تھا کسی یاد کے شبستاں میں
جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے

میں رو رہا تھا مقدر کی سخت راہوں میں
اڑا کے لے گئے جادو تری نظر کے مجھے

میں تیرے درد کی طغیانیوں میں ڈوب گیا
پکارتے رہے تارے اُبھر اُبھر کے مجھے

ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گے
مزے ملے انھیں راتوں میں عمر بھر کے مجھے

ذراسی دیر ٹھہر نے دے اے غم دنیا
بلا رہی ہے کوئی بام سے اُتر کے مجھے

پھر آج آئی تھی اک موجۂ ہوائے طرب
سنا گئی ہے فسانے اِدھر اُدھر کے مجھے

☆☆☆

معین احسن جذبی

غزل

دل سرد ہو تو وا لب گفتار کیا کریں
منصور کیا بنیں ہوس دار کیا کریں

اب کیا سنائیں یوسف وزنداں کی داستاں
پھر گرم جنس درد کا بازار کیا کریں

وہ ساغرِ نشاط ہو یا جام زہرِ غم
ساقی نے جب دیا ہوتو انکار کیا کریں

جذبی نگاہ میں ہے برہنہ سری کی شان
ہم احترامِ طرۂ دستار کیا کریں

☆☆☆

فیض احمد فیض

کُتّے

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کُتّے	کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی
زمانہ کی پھٹکار، سرمایہ اُن کا	جہاں بھر کی دھتکار،ان کی کمائی
نہ آرام شب کو، نہ راحت سویرے
غلاظت میں گھر، نالیوں میں بسیرے
جو بگڑیں تو اک دوسرے سے لڑا دو
ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دکھا دو
یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے
یہ فاقوں سے اُکتا کے مر جانے والے
یہ مظلوم مخلوق گر سر اُٹھائے	تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنالیں	یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبالیں
کوئی ان کو احساسِ ذِلّت دلا دے
کوئی اُن کی سوئی ہوئی دم ہلا دے

☆☆☆

مخدوم محی الدین

حویلی

ایک بوسیدہ حویلی یعنی فرسودہ سماج
لے رہی ہے نزع کے عالم میں مُردوں سے خراج

اک مسلسل کرب میں ڈوبے ہوئے سب بام و در
جس طرف دیکھو اندھیرا جس طرف دیکھو کھنڈر

مار و کژدم کے ٹھکانے جس کی دیواروں کے چاک
اف یہ رخنے کس قدر تاریک کتنے ہولناک

جن میں رہتے ہیں مہاجن، جن میں بستے ہیں امیر
جن میں کاشی کے برہمن، جن میں کعبے کے فقیر

رہزنوں کا قصرِ شوریٰ، قاتلوں کی خواب گاہ
کھلکھلاتے ہیں جرائم جگمگاتے ہیں گناہ

جس جگہ کٹتا ہے سر انصاف کا، ایمان کا
روز و شب نیلام ہوتا ہے جہاں انسان کا

زیست کو درسِ اجل دیتی ہے جس کی بارگاہ
قہقہہ بن کر نکلتی ہے جہاں ہر ایک آہ

سیم و زر کا دیوتا جس جا کبھی سوتا نہیں
زندگی کا بھول کر جس جا گزر ہوتا نہیں

ہنس رہا ہے زندگی پر اس طرح ماضی کا حال
خندہ زن ہو جس طرح عصمت پہ قحبہ کا جمال

ایک جانب ہیں وہیں ان بے نواؤں کے گروہ
ہاں انھیں بے نان و بے پوشش گداؤں کے گروہ

جن کے دل کچلے ہوئے جن کی تمنا پائمال
جھانکتا ہے جن کی آنکھوں سے جہنم کا جلال

اے خدائے دو جہاں اے وہ جو ہر اک دل میں ہے
دیکھ تیرے ہاتھ کا شہکار کس منزل میں ہے

جانتا ہوں موت کا ہم ساز و ہمدم کون ہے
کون ہے پروردگارِ بزمِ ماتم کون ہے

کوڑھ کے دھبّے چھپا سکتا نہیں ملبوسِ دیں
بھوک کے شعلے بجھا سکتا نہیں روح الامیں

اے جواں سالِ جہاں جانِ جہانِ زندگی
سار بانِ زندگی روحِ روانِ زندگی

جس کے خونِ گرم سے بزم چراغاں زندگی
جس کے فردوسی تنفّس سے گلستاں زندگی

بجلیاں جس کی کنیزیں زلزلے جس کے سفیر
جس کا دل خیبر شکن جس کی نظر ارجن کا تیر

ہاں وہ نغمہ چھیڑ جس سے مسکرائے زندگی
تو بجائے سازِ الفت اور گائے زندگی

آ انھیں کھنڈروں پہ آزاد کا پرچم کھول دیں
آ انھیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں

☆☆☆

اخترالایمان

عُمرِ گریزاں کے نام

عُمر یوں مجھ سے گریزاں ہے کہ ہر گام پہ میں
اس کے دامن سے لپٹا ہوں منایا ہوں اسے
واسطہ دیتا ہوں محرومی و ناکامی کا
داستاں آبلہ پائی کی سنا تا ہوں اسے
خواب ادھورے ہیں جو دہراتا ہوں ان خوابوں کو
زخم پنہاں ہیں جو وہ زخم دکھاتا ہوں اسے
اس سے کہتا ہوں تمنّا کے لب و لہجے میں
اے مری جان مری لیلیٰ تابندہ جبیں
سنتا ہوں تو ہے پری پیکر و فرخندہ جمال
سنتا ہوں تو ہے مہ و مہر سے بھی بڑھ کر حسیں
یوں نہ ہو مجھ سے گریزاں کہ ابھی تک میں نے
جاننا تجھ کو کجا پاس سے دیکھا بھی نہیں
صبح اٹھ جاتا ہوں جب مُرغ اذاں دیتے ہیں
اور روٹی کے تعاقب میں نکل جاتا ہوں
شام کو ڈھور پلٹتے ہیں چراگاہوں سے جب
شب گزاری کے لیے میں بھی پلٹ آتا ہوں
یُوں نہ ہو مجھ سے گریزاں مرا سرمایہ ابھی
خواب ہی خواب ہیں خوابوں کے سوا کچھ بھی نہیں

ملتوی کرتا رہا اپنے لیے ہموار زمیں
آج لیتا ہوں جوان سوختہ راتوں کا حساب
جن کو چھوڑ آیا ہوں ماضی کے دھندلکے میں کہیں
صرف نقصان نظر آتا ہے اس سودے میں
قطرہ قطرہ جو کریں جمع تو دریا بن جائے
ذرہ ذرہ جو بہم کرتا تو صحرا ہوتا
اپنی نادانی سے انجام سے غافل ہو کر
میں نے دن رات کیے جمع خسارہ بیٹھا
جاننا تجھ کو کجا پاس سے دیکھا بھی نہیں
اے مرے جان مری لیلی تابندہ جبیں
یوں نہ ہو مجھ سے گریزاں مرا سرمایہ ابھی
خواب ہی خواب ہیں خوابوں کے سوا کچھ بھی نہیں

۱۰ر جنوری ۱۹۶۱ء

☆☆☆

ساحرؔ لدھیانوی

مرے عہد کے حسینو

وہ ستارے جن کی خاطر کئی بے قرار صدیاں
مری تیرہ بخت دنیا میں ستارہ وار جاگیں
کبھی رفعتوں پہ لپکیں، کبھی وسعتوں سے الجھیں
کبھی سوگوار سوئیں ، کبھی نغمہ بار جاگیں

وہ بلند بام تارے ، وہ فلک مقام تارے
جو نشان دے کے اپنا، رہے بے نشاں ہمیشہ
وہ حسین، وہ نورزادے، وہ خلا کے شاہزادے
جو ہماری قسمتوں پر رہے حکمراں ہمیشہ
جنھیں مضمحل دلوں نے ابدی پناہ جانا
تھکے ہارے قافلوں نے جنھیں خضرِ راہ جانا
جنھیں کمسنوں نے چاہا کہ لپک کے پیار کرلیں
جنھیں مہوشوں نے مانگا کہ گلے کا ہار کرلیں
جنھیں عاشقوں نے چاہا کہ فلک سے توڑ لائیں
کسی راہ میں بچھائیں ، کسی سیج پر سجائیں
جنھیں بُت گروں نے چاہا کہ صنم بنا کے پوجیں
یہ جو دور کے حسیں ہیں انھیں پاس لا کے پوجیں
جنھیں مطربوں نے چاہا صداؤں میں پرولیں
جنھیں شاعروں نے چاہا کہ خیال میں سمولیں

جو ہزار کوششوں پر بھی شمار میں نہ آئے
کبھی خاک بے بضاعت کے دیار میں نہ آئے
جو ہماری دسترس سے رہے دور دور اب تک
ہمیں دیکھتے رہے ہیں جو بصد غرور اب تک

مرے عہد کے حسینو! وہ نظر نواز تارے
مرا دورِ عشق پرور تمھیں نذر دے رہا ہے
وہ جنون جو آب و آتش کو اسیر کر چکا تھا
وہ خلا کی وسعتوں سے بھی خراج لے رہا ہے

مرے ساتھ رہنے والو، !مرے بعد آنے والو
مرے دَور کا یہ تحفہ تمھیں ساز گار آئے
کبھی تم خلا سے گزرو کسی سیم تن کی خاطر
کبھی تم کو دل میں رکھ کے کوئی گلعذار آئے

☆☆☆

سکندر علی وجد

اجنتا

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہلِ ہُنر برسوں　　جہاں گھلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں
جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شر برسوں　　جہاں قائم رہے گی جنتِ قلب و نظر برسوں
جہاں نغمے جنم لیتے ہیں ، رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے

ہنرمندوں نے تصویروں میں گویا جان بھر دی ہے　　ترازو دل میں ہو جاتی ہے وہ کافر نظر دی ہے
اداؤں سے عیاں ہے لذتِ دردِ جگر ، دی ہے　　کھلیں گے راز ، اس ڈر سے دہن پر مہر کر دی ہے
یہ تصویریں بظاہر ساکت و خاموش رہتی ہیں
مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کی بات کہتی ہیں

گلستاں سے جو گزرا قافلہ فصلِ بہاری کا　　بہانہ مل گیا اہلِ جنوں کو حُسن کاری کا
چٹانوں پر بنایا نقش ، دل کی بے قراری کا　　سکھایا گُر اُسے جذبات کی آئینہ داری کا
امانت سینۂ کہسار میں اک داستاں رکھ دی
جگر داروں نے بنیادِ جہانِ جاوداں رکھ دی

جہاں چھوڑا خوشی سے جاوداں پیغام کی خاطر　　صف آرا تھے شکستِ گردشِ ایّام کی خاطر
جھکایا سر نہ اپنا شہرت و انعام کی خاطر　　جیے بھی کام کی خاطر مرے بھی کام کی خاطر
زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش ان کے ، نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

☆☆☆

ن۔م۔راشد

زندگی سے ڈرتے ہو

زندگی سے ڈرتے ہو؟
زندگی تو تم بھی ہو۔۔۔زندگی تو ہم بھی ہیں!
آدمی سے ڈرتے ہو؟
آدمی تو تم بھی ہو، آدمی تو ہم بھی ہیں!
آدمی زباں بھی، آدمی بیاں بھی ہے،
اس سے تم نہیں ڈرتے!
حرف اور معنی کے رشتہ ہائے آہن سے، آدمی ہے وابستہ
آدمی کے دامن سے زندگی ہے وابستہ
اس سے تم نہیں ڈرتے!
''ان کہی'' سے ڈرتے ہو؟
جو ابھی نہیں آئی، اس گھڑی سے ڈرتے ہو
اس گھڑی کی آمد کی آگہی سے ڈرتے ہو!

۔۔۔۔پہلے بھی تو گزرے ہیں،
دور نارسائی کے، ''بے ریا'' خدائی کے
پھر بھی یہ سمجھتے ہو، ہیچ آرزو مندی
یہ شبِ زباں بندی، ہے رہ خداوندی!

تم مگر یہ کیا جانو
لب اگر نہیں ملتے ، ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں
ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں، راہ کا نشاں بن کر
نور کی زباں بن کر
ہاتھ بول اٹھتے ہیں، صبح کی اذاں بن کر
روشنی سے ڈرتے ہو؟
روشنی تو تم بھی ہو، روشنی تو ہم بھی ہیں
روشنی سے ڈرتے ہو!

۔۔۔۔شہر کی فصیلوں پر
دیو کا جو سایہ تھا پاک ہو گیا آخر
رات کا لبادہ بھی
چاک ہو گیا آخر، پاک ہو گیا آخر
اژدہام انساں سے فرد کی نوا آئی
ذات کی صدا آئی
راہ شوق میں جیسے راہرو کا خوں لپکے
اک نیا جنوں لپکے!
آدمی چھلک اٹھے
آدمی ہنسے دیکھو، شہر پھر بسے دیکھو
تم ابھی سے ڈرتے ہو؟

☆☆☆

رُباعیات

جگت موہن لال رواں

(۱)

کیا تم سے بتائیں کہ عمر فانی کیا تھی
بچپن کیا چیز تھا جوانی کیا تھی
یہ گل کی مہک تھی وہ ہوا کا جھونکا
اک موجِ فنا تھی، زندگانی کیا تھی

(۲)

پابندی جان ودل سے زنجیرِ حیات
اللہ اللہ ر ی فکرِ توقیرِ حیات
آغاز کی کچھ خبر ہے نہ انجام کا علم
کونین ہے پھر بھی خوِ تدبیرِ حیات

مرزا دبیرؔ

(۱)

قطرے کو گہر کی آبرو دیتا ہے
قد سرو کو گل کو رنگ و بو دیتا ہے
بے کار تشخص ہے تصنع بے سود
عزت وہی عزت ہے جو تُو دیتا ہے

(۲)

نادان کہوں دل کو کہ خرد مند کہوں
یا سلسلۂ وضع کا پابند کہوں
اک روز خدا کو منہ دکھانا ہے دبیرؔ
بندوں کو میں کس منہ سے خداوند کہوں

☆☆☆